پروفیسر سید مقبول احمد

حیات و خدمات

مسعود الرحمٰن خاں ندوی

سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

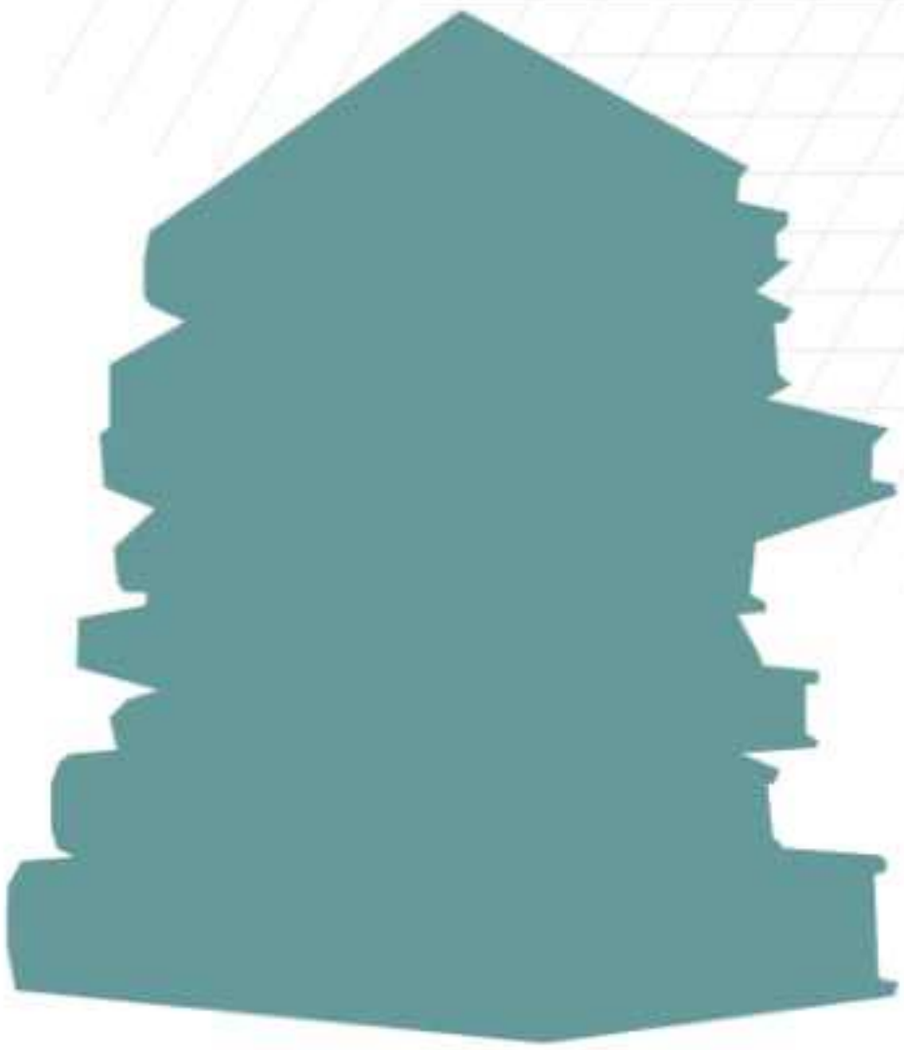

پروفیسر سید مقبول احمد

حیات و خدمات

مسعود الرحمٰن خاں ندوی

سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

129366

اشاعت : ۱۹۹۹ء
قیمت : -/۸۰روپے
غیر ممالک کے لیے : ۴ڈالر

طابع وناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

پروفیسر سیّد مقبول احمد

(پ: ۳ر مئی ۱۹۲۱ء، م: ۲۱ر فروری ۱۹۹۸ء)

حرف آغاز

شخصیات کا مطالعہ بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہوتا ہے۔ اگر ان سے واقفیت ہو تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ شخصیت نگاری ایک پر خطر وادی ہے۔ مصنف کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی اور رخشِ قلم بے قابو ہوا۔ صاحب معاملہ سے اگر عقیدت ہو تو غلو در آتا ہے یا راست گوئی میں بعض وہ حقائق قلمبند ہو جاتے ہیں جو دوسروں کی دلآزاری کا سبب بن جاتے ہیں۔ اعتدال ذرا مشکل ہوتا ہے۔ یہ تو قارئین ہی فیصلہ کریں گے کہ "پروفیسر سید مقبول احمد: حیات و خدمات" کی تصنیف میں مسعود الرحمٰن خاں ندوی ایک غیر جانبدار سوانح نگار کی حیثیت سے کہاں تک کامیاب ہیں۔

خدا بخش لائبریری میں تذکروں کا معتدبہ ذخیرہ موجود ہے، یہ صرف مخطوطات تک ہی محدود نہیں بلکہ مطبوعات کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اردو، فارسی، عربی کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی سوانح عمریوں کی ایک بڑی تعداد یہاں موجود ہے۔ حال ہی میں اس نے چند تذکرے شایع بھی کیے ہیں۔ ایک دن جب ندوی صاحب میرے ایک عزیز دوست احمد اشفاق صاحب (مسقط) کے ساتھ میرے غریب خانے (علی گڑھ) پر تشریف لائے اور اس کتاب کی اشاعت کی تجویز رکھی تو میں نے فوراً حامی بھر لی۔ اس کا پہلا سبب تو یہ تھا کہ مقبول صاحب کی شخصیت ایک عالم کی شخصیت تھی اور اس کو منظر عام پر آنا ہی چاہیے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اس لائبریری کے منعقدہ مذاکروں میں شرکت کرتے رہے تھے۔ ان کے افکار و آرا یہاں کی بعض مطبوعات میں شایع ہو چکی ہیں۔

یہ جان کر بڑا قلق ہوا کہ مقبول صاحب کی "آپ بیتی" اشاعت پذیر نہ ہو سکی۔ اس کا مسودہ مختلف ہاتھوں سے گزرا، وعدے وعید بھی ہوئے مگر سب لاحاصل۔ مرتے دم تک انھیں یہ انتظار رہا کہ شاید کوئی اس کی اشاعت کا مژدہ جانفزا

سنایے۔ افسوس وہ یہ حسرت لیے ہی چل بسے! اس تناظر میں مسعود الرحمٰن خاں کی یہ کوشش بلاشبہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جایے گی۔ یہ ایک سعادت مند شاگرد کی جانب سے استاذ محبّی کی خدمت میں خراج عقیدت ہے۔ مصنّف نے جابجا "آپ بیتی" سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔

مقبول صاحب سے میرا کوئی خاص تعلق نہیں رہا، ہاں ملاقات کئی بار ہوئی تھی۔ ان کی سادگی، خاکساری، نرم گوئی اور انسان دوستی ان کی وہ صفات تھیں جن سے لوگ صرف متاثر ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ فیض بھی اٹھاتے تھے۔ دوسروں کی مدد کا جذبہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا جس کی وجہ سے وہ اکثر مقروض بھی ہو جاتے تھے۔ خیر خواہی، انسانیت اور روشن خیالی ان کی سرشت میں شامل تھی۔

وہ بہت سے علمی اداروں کے مؤسّس تھے۔ ان کی علمی خدمات مادر وطن تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ دیار غیر بھی ان سے بہرہ مند ہویے تھے۔ ایک نحیف سے مشرقی پیکر میں مغربی تہذیب کا دیا روشن کیے ہویے تھے۔ جب بھی اس کی لو تیز ہوتی وہ مغرب کی آزاد اور بسیط فضاؤں کا رخ کرتے۔ زندگی کا کافی حصّہ سفر کی نذر ہو گیا۔ وہ ایک جہاں گشت تھے اور اس جہاں نوردی نے ان کے ذہن کے دریچوں کو وا کر دیا تھا۔

مصنف نے ان کی زندگی اور جذبات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ موادو معلومات حاصل کرنے میں انھوں نے جس محنت شاقّہ کا ثبوت دیا ہے وہ لائق ستایش ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست کو شامل کر کے اس کتاب کی افادیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ مقبول صاحب کے مطالعے میں یہ تصنیف ضرور مفید ثابت ہو گی۔

حبیب الرحمٰن چغانی
(ڈائرکٹر)

تاریخ: ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۹ء

فہرست مضامین

عرض حال

باب اول

خاندانی حالات ۱

پروفیسر سید مقبول احمد ۱۲

تعلیم وتربیت ۱۲

آزادی ہند کا پہلا تلخ تجربہ ۲۰

اہل وعیال ۲۱

حواشی ۳۰

باب دوم :

خدمات (درون ملک) ۳۷

بیرونی خدمات ۵۱

غیر ملکی اسفار ۷۷

سیاست میں حصہ ۹۴

حواشی ۹۸

باب سوم

تحقیقی اور تصنیفی تحریروں کا جائزہ ۱۰۹

اسلامی جغرافیہ ۱۱۰

بین الاقوامی تعلقات ۱۲۷

اسلامی علوم وفنون کی تاریخ ۱۳۱

متفرق ۱۳۴

غیر مطبوعہ تحریریں ۱۴۱

خلاصہ حیات ۱۵۰

حواشی ۱۵۳

عرضِ حال

پروفیسر سید مقبول احمد صاحب مرحوم (وفات ۲۱ فروری ۱۹۹۸ء) کی خوشگوار یاد کو زندہ و جاوید رکھنے کے لیے پروفیسر محمد سالم قدوائی (شعبہ اسلامیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے خواہش ظاہر کی کہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے یونیورسٹی کے علمی و ادبی سہ ماہی "فکر و نظر" علی گڑھ کے لیے ایک مقالہ تیار کروں، یہ کام خود میرے دل کی آواز تھی، جاری مشغولیت سے جلد از جلد نجات حاصل کر کے وسط مارچ ۱۹۹۸ء سے اس کی فکر شروع کی۔

ابتدا میں میری بھولی بسری یادوں کے علاوہ مرکز مطالعات مغربی ایشیا کے دفتر میں مقبول صاحب کے صرف دو قدیم نامکمل BIO-DATA دستیاب تھے، ان کے اور میری ناقص معلومات کے سہارے مقالہ کا خاکہ مرتب ہوا، یونیورسٹی کے مختلف دفتروں اور شعبوں کے ریکارڈس، متعدد لائبریریوں کے مواد، ونی (ناگپور) اور بھوپال میں صاحبِ سوانح کے قریبی رشتہ داروں سے حاصل کردہ معلومات اور علی گڑھ کے بعض احباب سے اپنی یادداشتوں کی تصدیق کے بعد اس کی تحریر کی نوبت آئی، رنگ بھرتے بھرتے اس سوانحی خاکہ کا حجم سالم بھائی کے رسالہ کے لیے امتحان اور میرے لیے آزمائش بن گیا۔

تکمیل سے فارغ ہوا تھا کہ اواخر اپریل ۱۹۹۸ء میں مقبول صاحب کی غیر مطبوعہ "آپ بیتی" ان کی نیک بخت ہمشیر آفتاب بیگم صاحبہ (عرف مشہر بانو) نے بغرض اشاعت علی گڑھ بھیج دی، اب دوہری مشکل کا سامنا تھا، میرے کتاب نما مقالہ کی اشاعت مسئلہ بنی ہوئی تھی کہ اسی ضمن میں استاد محترم کی "آپ بیتی" بھی شامل ہو گئی (ا) یک نہ شد دو شد!! بہر حال خود صاحب سوانح کی تحریر میں اس غیر متوقع قیمتی مواد کے ملنے کا خوش آئند نتیجہ یہ نکلا کہ میرے بیانات کی تصحیح و توثیق کے ساتھ حسبِ ضرورت بہت سے

کام کے اقتباسات ۔سے کتاب مزیّن ہو گئی اور مقبول صاحب سے گفت و شنید میں ان کے جن اشکالات کا پس منظر پوری طرح واضح نہ ہوا تھا ان کی تحریر سے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا، اگر چہ مجھ پر اس سوانح میں رنگ آمیزی کا گویا دوہرا بوجھ پڑ گیا۔

یہ بات اچھی طرح واضح رہے کہ جس طرح خود نوشت سوانح نگار کو اپنے اوپر گذرے ہوئے واقعات کے سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت اور تعلیل و توجیہہ کی آزادی ہوتی ہے، اسی طرح ان واقعات سے متعلق دیگر حضرات کا اپنا نقطۂ نظر اور مصالح و مجبوریاں بھی ہوتی ہیں جن کے لحاظ و اعتبار کا ان کو پورا حق ہوتا ہے۔اس حقیقت کے مد نظر راقم نے اختلافی مسائل میں ایک طرح سے غیر جانبداری کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، پھر بھی یہ بات کسی انسان کے بس میں کہاں ہے کہ اپنے ممدوح کی عقیدت اور خود اپنے برے بھلے تصورات سے آزاد ہو سکے؟! موجودہ تحریر سے بھی غیر شعوری طور پر کسی کو حق تلفی کی شکایت ہو سکتی ہے یا واقعات کی تعبیر و تشریح سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ دنیا و آخرت میں کوئی دامنگیر نہ ہو اس لیے ہر ایک سے معذرت کے ساتھ مرحومین کے لیے مغفرت کی دعا ہے اور بقید حیات بزرگوں سے معافی کی درخواست! ان حضرات کو تو اللہ کے فضل و کرم سے اپنے خیالات کے اظہار کی مہلت بھی ملی ہوئی ہے!

بہر حال کہنے کو تو یہ کام جون ۱۹۹۸ء میں مکمل ہو گیا اور سوانح کا حجم مزید بڑھ گیا، یعنی اس کی اشاعت کی تمام راہیں خود ہی مسدود کر لیں، لعل اللہ یحدث بعد ذٰلك امراً کا منتظر تھا کہ مقبول صاحب کے قدیم رفیق کار اور میرے مخلص دوست احمد اشفاق صاحب (لائبریرین سلطان قابوس یونیورسٹی، الخوض، مسقط، سلطنت عمان) جنوری ۱۹۹۹ء میں سالانہ تعطیل گذارنے علی گڑھ آئے، گرہ کشائی کے لیے مشورہ کیا تو خوش قسمتی سے جناب حبیب الرحمٰن صاحب چغانی (ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ) سے ملاقات و تعارف ہوا، یہ کتاب بھولی بسری فائلوں میں دفن ہونے سے بچ گئی، اس لیے ذاتی طور پر چغانی صاحب، ان کے تمام رفقائے کار اور خدا بخش لائبریری کا جتنا

بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے، حقیقتاً میں ان کا بہت احسانمند ہوں، خدا ان کا بھلا کرے اور اپنی رحمت بے پایاں سے دنیا و آخرت میں نوازے۔ آمین

مسعود الرحمٰن خاں ندوی

اے۔۱۴۱ میڈیکل کالونی،
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ (یوپی)
۱۲/اگست ۱۹۹۹ء

۱۔افسوس کہ اس "آپ بیتی" کی اشاعت کی کوئی سبیل نہ نکل سکی اور مقبول صاحب کی صاحبزادی ڈاکٹر زہرہ بانو کی آمد علی گڑھ بتاریخ ۳-۶/اپریل ۱۹۹۹ء کے موقع پر ان کے واسطہ سے واپس بھیج دی گئی۔

پروفیسر سید مقبول احمد
حیات و خدمات

مسعود الرحمٰن خاں ندوی

باب اول

خاندانی حالات

فصل اول

(۱)
قدیم رشتے ناتے

پروفیسر سید مقبول احمد صاحب کے خاندان کا تعلق سادات نو محلّہ بریلی سے ہے۔ ان سادات کا سلسلۂ نسب سید السادات علی ترمذی بنیری معروف بہ غوث زمان خراسانی تک پہنچتا ہے۔ خاندانی شجرہ کے مطابق سید علی ترمذی، سید قمر علی شاہ کے اور وہ سید احمد نور شاہ ترمذ کے فرزند تھے۔ پھر یہ سلسلہ سید شاہ ناصر خسرو کے واسطہ سے حضرت زین العابدین بن حضرت حسین بن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

سید قمر علی شاہ کی شادی ہمایوں کی ہمشیرہ سے ہوئی اور شہر کنہر (افغانستان) جہیز میں ملا، پھر وہ ہندوستان آئے اور مقبرۂ ہمایوں دہلی میں مدفون ہیں۔

سید علی ترمذی کنہر ہی میں رہے، اخون درویزہ بابا نے ان کی ایک شادی بابر کی لڑکی سے اور دوسری شادی بنیر کے بادشاہ کی دختر سے کرائی جس سے ان کے اکلوتے فرزند سید مصطفیٰ فرمانروائے کنہر پیدا ہوئے۔ سید علی ترمذی "پاجا" میں مدفون ہیں۔ سید مصطفیٰ کے فرزند سید عبدالوہاب (عرف عبدل بابا) شلی ہانڈی میں مدفون ہوئے۔ ان کے فرزند سید جمال، ان کے صاحبزادے سید عباس اور ان کے بیٹے سید احمد (عرف شاہ جی یا جیو بابا) حسینی کنہری ترمذی تھے جن کی وفات غالباً ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں ہوئی اور ان کا مزار احاطہ جامع مسجد نو محلّہ، بانس بریلی میں ہے۔

سید احمد کے فرزند سید معصوم، نادر شاہ کے ساتھ آٹھ ہزار فوج لے کر افغانستان سے ہندوستان آئے لیکن اس کے ظلم و بربریت سے عاجز آکر اس کو بددعا دی اور خود عظیم

آباد (پٹنہ) چلے گئے۔ بعد میں احمد شاہ درّانی نے بہلا پھسلا کر منایا اور بانس بریلی میں چھ سو چوراسی مواضعات نذر کئے۔ جیپور، جودھپور، کوٹہ، بوندی سے بارہ بارہ ہزار کی جاگیریں عطا کرائیں۔ تین لاکھ صوبہ اودھ سے مقرر ہوا اور آٹھ ہزار سواروں کی تنخواہ اور دو توپخانوں کا خرچ دہلی سے متعین ہوا۔ انگریزی عملداری میں یہ سب مراعات اور بخششیں چھنتے چھنتے مقبول صاحب کی پردادی (سیدہ آفتاب بیگم عرف سیدانی بی؟) کے نام صرف ملک اور بچھورا دو گاؤں رہ گئے۔ سید معصوم کا مزار قلعہ نو محلہ، بانس بریلی میں ہے۔ ان کے فرزند سید شاہ، ان کے صاحبزادے سید محمد عیسی، ان کے بیٹے سید معصوم احمد تھے جو بریلی میں مدفون ہیں۔

پردادا

سید معصوم احمد کے چار بیٹوں میں سید معصوم عیسی، سید مقبول عیسی اور دیگر دو (جن کے نام معلوم نہیں) تھے۔ غالباً غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی والدہ (سیدانی) نے بریلی کو خیر باد کہا اور سب بچوں کو لے کر حج کو چلی گئیں اور واپسی پر اجمیر میں قیام پسند کیا۔ فرمانروائے جاورہ نواب اسماعیل خان کو ایک خواب میں آنحضرت ﷺ کا اشارہ ہوا کہ اس خاندان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے تو انہوں نے سیدانی اور ان کے بیٹوں کو اعزاز و اکرام کے ساتھ جاورہ لانے کی کوشش کی لیکن صرف سیدانی اور مقبول عیسی جاورہ میں آباد ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں جب مقبول صاحب جاورہ گئے تو مقبول عیسی کی اہلیہ اور ان کے دو بیٹوں: سید مخدوم میاں اور سید نرالے میاں سے ان کی قیامگاہ بوہرہ باکھل میں ملاقات ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ لوگ پہلے حیدر آباد سندھ اور بعد میں غالباً کراچی منتقل ہوگئے تھے۔ نامعلوم الاسم دو بیٹوں کے حیدر آباد دکن میں مناصب مقرر ہوگئے تھے اس لئے وہ وہیں آباد ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔

اس خاندان کے کچھ افراد بھوپال میں بھی سکونت پذیر ہوئے تھے۔ ان میں

سے کپتان سید حامد اور کپتان سید محمود ریاست کے رسالہ میں ملازم تھے اور تاج المساجد سے متصل نور محل کے علاقہ میں رہتے تھے۔ مقبول صاحب کو یاد تھا کہ ان کے قیامِ بھوپال کے دوران وہ دونوں ان کی والدہ (وفات ۱۹۲۷ء) سے ملنے آتے جاتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب مقبول صاحب بمبئی سے بھوپال آئے تو انہوں نے ان دونوں کے گھر میں بریلی سے آئی ہوئی خاندان کی چند بزرگ خواتین کو بھی دیکھا تھا جو پشتو زبان میں بات چیت کرتی تھیں۔ فی الوقت بھوپال میں مقیم مقبول صاحب کے چچازاد بھائی ماسٹر حبیب احمد صاحب کا بیان ہے کہ تقسیم ملک کے بعد یہ دونوں بزرگ مع اہل و عیال پاکستان چلے گئے تھے۔

دادا

سید معصوم عیسی مہاراجہ جودھپور کی پیشکش پر صوبہ پھلودی کے ناظم مقرر ہوئے تو وہیں بود و باش اختیار کی، پھر وہیں ان کی وفات ہوئی اور پرانی کچہری کے سامنے "پیرجی" کے نام سے ان کا مزار ہے۔ ان کی اولاد میں سید احمد شاہ، سید محبوب شاہ (والد ماجد مقبول صاحب) اور سید محی الدین شاہ تھے۔ والد کے انتقال کے بعد یہ تینوں بھائی اپنے چچا مقبول عیسی کے پاس چلے گئے پھر جلد ہی وہاں سے تتر بتر ہوئے۔

تایا

سید احمد شاہ حسینی بھوپال چلے گئے تھے، اچھے خطّاط تھے، کچھ عرصہ ریاست میں ناکیدار رہے، بھوپال ہی کی ایک خاتون صالحہ بی سے شادی ہوئی، آخر میں طویل مدت بیروزگاری میں گذاری۔ ان کی اکلوتی بیٹی رفیقہ (۲) کی شادی عبیداللہ گنج میں عبدالصمد صاحب سے ہوئی تھی، جہاں کثرت سے آمدورفت رہتی تھی، ایسے ہی کسی سفر میں ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ وہاں ان کا وقتِ آخر آگیا اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کی بیگم کی

وفات غالباً ۱۹۶۴ء میں بھوپال میں ہوئی۔ مذکورہ لڑکی کے علاوہ ان کے تین صاحبزادے : محمد احمد، (۳) حبیب احمد (۴) اور محبوب احمد (۵) پیدا ہوئے۔ یہ خاندان بھی بھوپال میں مقبول صاحب کے آبائی مکان (۶) میں ان کے قلیل المدت قیام بھوپال کے زمانہ سے رہتا چلا آرہا تھا، افراد خاندان میں اضافہ کے لحاظ سے حبیب احمد عرصہ ہوا اس مکان کو چھوڑ چکے، چھوٹے بھائی محبوب احمد مع اہل و عیال اب بھی وہیں مقیم ہیں۔ مقبول صاحب کی والدہ کی وفات کے بعد یہ مکان ان کی بہن آفتاب بیگم عرف شہر بانو کے نام سے ہو گیا تھا، سنا ہے کہ وہ اب اس کو موجودہ مقیمین کے نام ہبہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

چچا

حکیم سید محی الدین شاہ حسینی نوعمری ہی میں جاورہ سے برار چلے گئے تھے، وہاں انہوں نے طب یونانی کی تعلیم حاصل کی اور مطب کرنے لگے، پھر وہاں ان کی شادی شہزادی بیگم سے ہوئی۔ مقبول صاحب کی والدہ کی وفات کے بعد جب ان کے والد ۱۹۲۷ء میں چھوٹے بچوں کو بھوپال سے بمبئی لے گئے تو شاید انہیں کے مشورہ سے یہ بھائی اور بھابھی بمبئی منتقل ہوئے اور وہاں طب کی کامیاب پریکٹس جاری رکھی۔ شہسواری کا شوق تھا، کرکٹ کے اچھے کھلاڑی تھے، خود طبّی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے اور بمبئی کی تعلیم کے دوران ہی سے مقبول صاحب کو عربی، فارسی مخطوطات کو ایڈٹ کر کے شائع کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے، کسے معلوم تھا کہ ان کی یہ تشویق ایک نوعمر ہونہار طالبعلم کی زندگی کا سرمایہ بن جائیگی اور اس کی ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذر یگی! بہر حال ۱۹۵۴ء میں حکیم صاحب اور ۱۹۶۷ء میں ان کی بیگم کا انتقال ہوا۔ ان کی اولاد میں چار بیٹے: شمس الدین (۷)، بدرالدین، (۸) صلاح الدین (۸) شریف الدین (۹) اور دو لڑکیاں: مہربانو (۱۰) اور قمر بانو (۱۱) پیدا ہوئیں۔

والدین

قاضی سید محبوب شاہ حسینی (ولادت پھلودی، جودھپور تقریباً ۱۸۹۰ء) غالباً انیسویں صدی کے اواخر ہی میں جاورہ سے بمبئی آگئے تھے۔ وہاں مدرسہ زکریا (مسجد محمد علی روڈ) میں عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ فراغت کے بعد شافعی قاضی محمد حسن مرگھے کے ساتھ بمبئی ہی میں نائب قاضی کی حیثیت سے کام کیا، قاضی صاحب کی وفات کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں مقبول صاحب کی والدہ ہدایت النساء عرف جانی بیگم دختر سید سیدان صاحب سے شادی ہوئی۔ پھر بھوپال کے قریب مالا اور پٹھاری دو چھوٹی ریاستوں کے مختار ہوئے تو کچھ عرصہ وہاں گذارا۔ مالا میں ۱۹۱۹ء میں بڑے فرزند سید معصوم احمد اور پٹھاری میں ۱۹۲۱ء میں چھوٹے صاحبزادے سید مقبول احمد کی ولادت ہوئی۔

شہسوار تھے اور تیرنا بھی جانتے تھے لیکن دوران ملازمت بیتول ندی کے بند میں شگاف پڑنے کی اطلاع ملی، ایک انجینیر کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر معائنہ کے لئے گئے، اسی وقت بند ٹوٹا، کشتی الٹی اور یہ لوگ سیلاب کے تیز دھارے کی لپیٹ میں بے دست وپا بہنے لگے۔ اولیاء کی کرامتوں کے معتقد اور خواجہ معین الدین اجمیری کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے، خود ان کے بقول موت کے پنجے بلکہ شکنجے سے صرف خواجہ کی یاد کی برکت سے ڈوبتے ڈوبتے یقینی موت سے بچے!

وہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی (۱۲۷۲-۱۳۴۰ھ / ۱۸۵۶-۱۹۲۱ء) کے بھی بہت قائل تھے اور ان کے پیر ومرشد مارہرہ کے بزرگ صوفی سید شاہ آل رسول (وفات ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) کے پرپوتے سید شاہ اولاد رسول محمد میاں سے اپنی ممانی سیدہ آفتاب بیگم عرف سیدانی بی کی بیٹی سیدہ منظور فاطمہ بنت سید وجیہہ الدین احمد کی نسبت پر فخر کرتے تھے! وجیہہ الدین کا نسب بھی امام حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا حادثہ کے کچھ عرصہ کے بعد کسی وجہ سے مع اہل و عیال بھوپال آگئے اور اسلامی گیٹ، شاہجہاں آباد کے پاس ایک چھوٹے سے کچے گھر (۱۲) میں رہنے لگے، عسرت اور تنگدستی کا زمانہ تھا۔ ان کے بھتیجے سید حبیب احمد صاحب (۱۳) کا بیان ہے کہ بھوپال میں ایک صابون فیکٹری بھی قائم کی تھی لیکن توقع کے مطابق اس سے نفع حاصل نہ ہوا تو بیچ دی، بعد میں وہ ملا صابون فیکٹری کے نام سے مشہور ہوئی۔ بہر حال تنگی سے عاجز آکر کچھ عرصہ بعد تنہا بمبئی چلے گئے، بیگم اور بچے بھوپال ہی میں تھے۔ یہاں غالباً ۱۹۲۵ء میں ان کے ہاں ایک صاحبزادی آفتاب بیگم عرف شہر بانو کی ولادت ہوئی اور شاید ۱۹۲۷ء میں دوسری بچی کی ولادت میں مقبول صاحب کی والدہ کو Tetanus ہو گیا اور شوہر کی غیر موجودگی میں ان کی وفات ہوئی! ان کی وفات کے وقت مقبول صاحب کی عمر اتنی کم (چھ یا آٹھ سال) تھی کہ ان کو والدہ کی شکل و صورت بھی یاد نہ رہ پائی تھی، تصویروں کا عام رواج نہ تھا، ان کو صرف یہ خیال رہ گیا تھا کہ وہ بھوپالی لباس پہنتی تھیں یعنی چست اور بی پاجامہ پر کمر تک تنگ گھیر دار دامن کا ترکی کرتا اور بہت لمبا ڈوپٹہ! بہر حال اس اچانک حادثہ فاجعہ کے بعد ۱۹۲۷ء میں مقبول صاحب کے والد بچوں کو اپنے ساتھ بمبئی لے گئے۔ ابتدا میں سیٹھ گلنکڑ (تربوز والے) کے مکان (نزد کرافورڈ مارکیٹ) میں قیام کرایا، پھر جلد ہی چچا (حکیم سید محی الدین) اور چچی کے بمبئی آنے کے بعد کرلا میں سکونت اختیار کی۔

اس اثنا میں ان کو بمبئی میں "حنفی" دارالقضاء کی ضرورت کا احساس ہوا، قائد اعظم محمد علی جناح کے مشورہ سے ۱۹۲۹ء میں عدالت میں ایک حلف نامہ داخل کیا جس پر بمبئی کے تین سو حنفی مسلمانوں کے دستخط تھے اور اس طرح وزیر مینشن، سر رحمت اللہ روڈ پر اپنا ذاتی محکمہ قضا قائم کر لیا۔

مقبول صاحب کی والدہ کی وفات کے پانچ چھ سال بعد ۱۹۳۲ء میں ان کے والد کی دوسری شادی بھوپال کی ایک نیک بخت خاتون سیدہ بیگم سے ہوئی، انہوں نے بچوں

کو ماں کا پیار و محبت دیا، بچے بھی ان سے اتنے مانوس ہوگئے کہ وہ ان کو "بی اماں" کہتے تھے۔ مقبول صاحب نے اپنی کتاب "مسعودی بحیثیت جغرافیہ نگار" کی والدین کے نام نذر میں والدہ کے لیے صرف "بی اماں" ہی لکھا ہے، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بچوں کے ہوش و حواس کی ماں اصلاً یہی سیدہ بیگم تھیں، مگر افسوس کہ وہ بھی ناپائیدار زندگی کے چند سال ہی لکھا کر لائی تھیں، ۱۹۴۰ء میں اجنّین میں ان کی وفات بھی ہوگئی اور بچے پھر ماں کی ممتا سے محروم ہوگئے اگرچہ وہ اب خاصے بڑے ہو چکے تھے۔ ان کی اولاد میں صرف ایک لڑکی فریدہ بانو (۱۴) تھیں۔

۱۹۴۲ء میں مقبول صاحب کے والد کی تیسری شادی شوکت بانو سے ہوئی۔ تقسیم ہندو پاک کے بعد (جب مقبول صاحب انگلینڈ میں زیر تعلیم تھے) ان کے والد شوکت بانو اور ان کی اولاد کے ساتھ کراچی منتقل ہوگئے تھے اور وہاں بھی شاید قضاۃ ہی ان کا مشغلہ تھا۔

ان کی وفات کراچی ہی میں ہوئی لیکن تاریخ وفات کا علم مقبول صاحب کی غیر مطبوعہ "آپ بیتی" سے بھی نہیں ہوتا، نہ تکمیل تعلیم کے بعد انگلینڈ سے واپسی ۱۹۵۱ء میں ہندوپاک میں کہیں ان سے ان کی ملاقات ثابت ہوتی ہے، نہ لاہور کے دوسرے سفر (۱۵) ۱۹۵۶ء میں فریدہ بہن سے ملاقات کے ذکر کے باوجود والدین اور ان کی اولاد کا حال احوال ملتا ہے، پھر چند عرب ممالک کے پہلے سفر سے واپسی (بصرہ تا بمبئی) میں بحری جہاز سے ۱۱ر مئی ۱۹۶۴ء کو کراچی (منورا پیئر) پہنچنے کا ذکر ہے، جہاں ان سے ملنے ان کی تیسری والدہ مع اپنی اولاد کے آئیں اور والد کی کچھ یادگار چیزیں ان کو پیش کیں۔ "آپ بیتی" میں مقبول صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"..... میری والدہ شوکت بانو بھی اپنے بچوں کے ساتھ آگئیں، وقت کم تھا اس لئے میں ان کے گھر نہ جاسکا، کم از کم ان سے برسوں کے بعد ملاقات تو ہوگئی اور اپنے بھائی بہنوں کو بھی دیکھ لیا۔ والدہ نے کچھ چیزیں جو والد

میرے لئے چھوڑ گئے تھے سونے کی گھڑی وغیرہ مجھے دیں، مگر میں نے انہیں
واپس کر دیا اور کہا کہ آپ ہی انہیں حفاظت سے رکھئے۔"

اس تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مئی ۱۹۶۴ء سے پہلے مقبول صاحب کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس کو کافی عرصہ گذر چکا ہو۔ ایڈوکیٹ ناصر الدین ایاز کے مطابق شوکت بانو کی وفات بھی تین چار سال قبل ہو چکی ہے۔ ان کی اولاد میں: سید منصور احمد عرف قیصر، فیروز بانو، شائستہ بانو اور دلشاد بانو ہیں۔(۱۶)

مقبول صاحب کی اپنے والد صاحب کے معاملہ میں اس ظاہری لاتعلقی کی وجہ وہ کشیدگی ہو سکتی ہے جو ان کے دوران تعلیم انگلینڈ میں ۱۴ر نومبر ۱۹۴۷ء کو ایک انگریز خاتون سے شادی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہوگی، اگرچہ "آپ بیتی" میں مقبول صاحب کی وضاحت کے مطابق انہوں نے ان سے اس کی اجازت حاصل کر لی تھی اور ۱۹۵۳ء میں ہندوستان آتے ہوئے بیگم مقبول صاحب نے اپنے سسر سے کراچی میں ملاقات کی تھی، لیکن ابھی تک ہندوستانی خاندانوں، میں غیر ملکی شادیاں خوشدلی سے برداشت نہیں کی جاتی ہیں۔ بہر حال یہ ایک احتمال ہی ہے ورنہ مقبول صاحب کی اپنے والد ماجد کی عزت و احترام اور قلبی تعلق کی دلیل ان کی دو کتابیں ہیں جن کو انہوں نے ان کے نام نذر کیا ہے یعنی India and the Neighbouring territories مطبوعہ ۱۹۶۰ء اور "مسعودی بحیثیت جغرافیہ نگار" مطبوعہ ۱۹۷۸ء۔ اس کے علاوہ یاد ہے کہ ایک دن صبح کے وقت میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان کے کرایہ کے مکان واقع کیلا نگر پہنچا تو ان کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی، صاحب تصویر پاجامہ، شیروانی، ترکی ٹوپی میں ملبوس تھے، سیاہ شرعی داڑھی اس پر مستزاد، دیر تک اس پر قیاس آرائیاں اور جملہ بازیاں ہوتی رہی تب جا کر بھید کھلا کہ یہ تو ان کے والد بزرگوار کی جوانی کا فوٹو ہے۔ یہ واقعہ بہر حال ان کی عمر کے آخری چار پانچ سال کا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنہائی میں اس فوٹو کے ذریعہ اپنی قدیم یادیں تازہ کرتے رہتے تھے۔

بھائی

قاضی سید معصوم احمد عرف عزیز کی مالاریاست میں ۱۹۱۹ء میں ولادت ہوئی، کھیل کود سے زیادہ دلچسپی تھی اس لئے ایک حد تک عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور Sir. J. School of Arts بمبئی سے ایک سال کی ٹریننگ حاصل کی، بمبئی کی ایک افغان خاتون زبیدہ بیگم سے ۱۹۴۱ء میں ان کی شادی ہوئی۔ فروری ۱۹۵۱ء میں جب مقبول صاحب انگلینڈ سے ہندوستان واپس آئے تو والد ماجد پاکستان جاچکے تھے اور دفتر قضاۃ کی ذمہ داری بڑے بھائی پر آچکی تھی جس کو انہوں نے بخوبی سنبھال لیا تھا۔ نوجوانی ہی سے پھیپھڑوں کے موذی مرض کا شکار تھے، ۵ر فروری ۱۹۷۴ کو بعمر پچپن سال انتقال ہوا اور ان کی اہلیہ زبیدہ کی ۱۹۷۸ء میں وفات ہوئی۔ ان کی اولاد میں چار صاحبزادے: سید آفتاب احمد،(۱۷)سید مہتاب احمد،(۱۸) سید شہاب احمد(۱۹)، سید نواب احمد(۱۹) اور تین صاحبزادیاں: شاہجہاں بیگم(۲۰)، نورجہاں بیگم(۲۱) اور ممتاز جہاں بیگم(۲۲) ہیں۔

بہن

سیدہ آفتاب بیگم عرف شہر بانو مقبول صاحب سے چار سال چھوٹی ان کی سگی بہن ہیں، ان کی ولادت ۱۹۲۵ء میں ہوئی ہوگی۔ ۱۹۴۱ء میں ان کی شادی برار کے ایک مشہور زمیندار خاندان کے چشم و چراغ عبدالرؤف احمد(۲۳) صاحب سے ہوئی اور انہوں نے ایک خاندانی بڑی حویلی رزاق منزل(۲۴) کو آباد کیا، کہا جاتا ہے کہ ماشاء اللہ اس مبارک گھرانہ میں چار دیوروں، گیارہ نندوں اور رؤف صاحب کی پہلی بیوی سے ان کے دو صاحبزادوں (۲۵) کے علاوہ قریب و دور کے دیگر اعزہ بھی شامل تھے۔ اس نیک بخت نوعمر خاتون نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے نہ صرف اس بڑے خاندان کی ذمہ

داریوں کو بحسن وخوبی سنبھالا بلکہ اپنے خاندان کے دیگر ضرورتمند بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت کی فکر بھی کی اور شوہر کی وفات ۲۰/اکتوبر ۱۹۶۴ء کے بعد ان کی جائیداد، زمینوں اور کاشت کی خود دیکھ بھال کی۔ بعد میں مقبول صاحب کے لئے بھی وہیں جائیداد بنائی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بھی وہیں ان کے ساتھ مقیم ہوں، مقبول صاحب کے وہاں مستقل قیام کی نوبت تو نہ آئی لیکن وہ بڑی محبت اور اصرار سے ان کو وہاں طویل ترین قیام کے لیے بلاتی رہتی تھیں، مقبول صاحب کی تنہائی سے فکرمند ہوتیں اور کسی تکلیف یا بیماری کا سن کر علی گڑھ آجاتیں، ایسے ہی کسی موقع پر مقبول صاحب کے ریٹائرمنٹ سے پہلے راقم کو ایک بار ان کی علی گڑھ آمد اور ملاقات اچھی طرح یاد ہے، خود مقبول صاحب کو بھی ان سے بہت زیادہ انس و تعلق تھا اور اپنی مشغولیت کی طویل زندگی میں سے وقت نکال کر ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ کینسر کی مہلک بیماری سے کچھ افاقہ کے بعد راقم کے نام ایک خط مورخہ ۷/جون ۱۹۹۶ء میں ان کا بالواسطہ تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے:

"سوچ رہا ہوں کہ اب کی بھوپال کا بھی ایک چکر لگالوں، برسوں سے نہیں گیا ہوں، وہ تو شہر بانو اور بمبئی کے راستہ میں پڑتا ہے۔"

ضعف اور خرابیٔ صحت کی وجہ سے سفر بھوپال کی آخری خواہش تو پوری نہ ہوئی لیکن ہندوستان کے آخری دو سفروں کا تقریباً پورا قیام انہی بہن آفتاب بیگم کے ساتھ رہا اور وفات سے ایک عشرہ قبل ۱۲/فروری ۱۹۹۸ء کو انہیں نے مقبول صاحب کو ٹاٹا انسٹیٹیوٹ میں معائنہ کی غرض سے بمبئی بھیجا، جہاں ۱۷/فروری ۱۹۹۸ء کو بیگم، بیٹیاں: زہرہ اور جنیفر اور نواسیاں: زرینہ اور زاہدہ بھی اعزّہ سے ملاقات اور مقبول صاحب کو اپنے ساتھ لندن واپس لے جانے کے لئے آنے والی تھیں، بیٹیاں اور نواسیاں تو حسبِ پروگرام وقت پر پہنچ گئیں، لیکن بروقت پاسپورٹ کی میعاد میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے بیگم کو پہنچنے میں تاخیر ہوئی، وہ ۲۱ فروری ۱۹۹۸ء کو (دن میں ساڑھے دس بجے مقبول

صاحب کی وفات کے بعد) شب میں پہنچیں اور دوسرے دن تدفین ہوئی، افسوس کہ پچاس سالہ رفاقت کی آخری گھڑیوں میں وصل کی حسرت ایک داغ چھوڑ گئی!

بہر حال ذکر تو آفتاب بیگم کا ہو رہا تھا، ان کی ایک اور خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ اس بھرے پُرے خاندان کو (جو ساٹھ سال میں کئی گنا بڑھ چکا ہے) جوڑے رکھنے کا بھی ملکہ رکھتی ہیں، نیز تعلیمی امور سے دلچسپی اور تعلیمی اداروں کی عملی مدد میں بھی پیش پیش رہتی ہیں، اس کی چند مثالیں میرے علم میں ہیں:

☆ ونی میں ایک چھوٹا موٹا اسکول مسلم بچوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا، مقبول صاحب کے ونی میں قیام سے ان کو یہ امید بھی تھی کہ وہ قابلِ ذکر ادارہ بن جائیگا۔

☆ عرصہ ہوا مقبول صاحب کے مشورہ اور انہیں کے واسطہ سے انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک سو روپیہ ماہانہ کا ایک میرٹ اسکالرشپ قائم کیا تھا، جو آرٹس اور سوشل سائنسز کے 10+2 کے طلبا کے لئے مخصوص تھا، اس کا نام عبدالرؤف احمد۔ آفتاب بیگم، ونی اسکالرشپ ہے، اس مقصد کے لئے انہوں نے تیرہ ہزار سے زیادہ کی رقم یکمشت جمع کی تھی کہ اس کے منافع سے یہ نیک کام جاری ہے۔

☆ اسی زمانہ کے آس پاس تاج المساجد بھوپال کے نو تعمیر شمالی بازو کے شاید دو دروں کی تعمیر میں بھی انھوں نے حصہ لیا تھا، جن میں سے ایک ان کے شوہر عبدالرؤف احمد صاحب اور دوسرا ان کے خسر عبدالرزاق احمد صاحب کے ایصال ثواب کے لئے تھا۔

فصل دوم

پروفیسر سید مقبول احمد عرف قمر

ولادت

"آپ بیتی" میں مقبول صاحب کی تحریر کے مطابق ان کی ولادت پٹھاری ریاست میں اس وقت ہوئی جب ان کے والد ماجد وہاں کے مختار ریاست تھے۔ ان کے سنِ ولادت میں کہیں کوئی غلطی ہوئی اور ان کے بڑے بھائی سید معصوم احمد کی پیدائش ۱۹۱۹ء مقبول صاحب کے سر لگ گئی۔ حالانکہ ان کی صحیح تاریخ ولادت ۳/ مئی ۱۹۲۱ء تھی مگر ولادت کے تصدیق نامہ میں ۳/ مئی ۱۹۱۹ء درج ہے، پھر یہی سرکاری تاریخ آخر عمر تک چلتی رہی اور اس کی تصحیح کرانے کی انہوں نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی، حالانکہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تو یہ باب ایک زمانہ میں ایسا چوپٹ کھلا تھا کہ اس میں ہر انہونی عرصہ تک بار بار ہوتی رہی۔

تعلیم و تربیت

مقبول صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھوپال میں ہوئی۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم والدہ ماجدہ ہی نے دی، سات سال کی عمر میں فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھ لی تھیں، ناظرہ قرآن ختم کر لیا تھا اگرچہ حفظ مکمل نہ کر سکے، اپنے کو سات پاروں کا حافظ کہا کرتے تھے، شاید والدہ کچھ اور جی جاتیں تو حفظ بھی مکمل کر لیتے، ان کی والدہ کی وفات ۱۹۲۷ء میں ہو گئی تھی۔

انہوں نے "آپ بیتی" میں لکھا ہے کہ تاج المساجد بھوپال میں ایک مدرسہ تھا جہاں عربی پڑھنے جایا کرتے تھے، ہو سکتا ہے ان کی مراد تاج المساجد کے بیرونی احاطہ میں

جنوب مشرقی کونہ پر واقع مدرسہ عبیدیہ سے ہو جو اصلاً حفظ قرآن کریم کے لیے تھا، ممکن ہے وہاں ابتدائی عربی بھی پڑھائی جاتی ہو، دوسرا سرکاری اسکول تاج المساجد کے مغرب میں الگزنڈریہ تھا جہاں عصری تعلیم ہوتی تھی، تیسرا سرکاری اسکول محلہ شاہجہاں آباد (جہاں ان کا گھر تھا) اور تاج المساجد کے درمیان تقریباً وسط میں ماڈل اسکول تھا، معلوم نہیں مقبول صاحب کے ذہن میں کس مدرسہ کا نقش باقی رہ گیا جس کی طرف انہوں نے اوپر اشارہ کیا ہے؟ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال (قائم شدہ ۱۹۴۸ء) سے قبل تاج المساجد کے اندر ابھی تک کسی اور ابتدائی عربی مدرسہ کے وجود کی تصدیق نہ ہو سکی، عین ممکن ہے کہ وہ حافظ صاحب جو ان کے گھر ان کو حفظ کرانے جاتے تھے وہ تاج المساجد کے اندر کچھ بچوں کو پڑھاتے ہوں یا آس پاس کے مذکورہ بالا مدرسوں سے ان کا تعلق ہو اور مقبول صاحب ان کے ساتھ کبھی وہاں گئے ہوں، اس لئے کہ انہوں نے "آپ بیتی" ہی میں دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "بھوپال میں، میں نے کسی ایک مدرسہ یا اسکول میں باقاعدگی سے نہیں پڑھا، جگہ جگہ پڑھا"۔ اس وقت ان کی عمر (چھ یا آٹھ سال) کو دیکھتے ہوئے یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ گھر کے بزرگوں یا گھر پر پڑھانے والے معلموں کے ساتھ اس علاقہ کے مدارس میں کبھی آئے گئے ہوں۔ بہر حال یہ بات صحیح ہے کہ بڑے بھائی کے برخلاف مقبول صاحب کی تعلیم سے دلچسپی کو دیکھتے ہوئے بھوپال میں ان کی والدہ کو اور بمبئی میں والد کو ان کو عالم و فاضل بنانے کی ضرورت سے زیادہ جلدی تھی، جس کی وجہ سے بمبئی میں بھی یہی تماشا جاری رہا اور جلد بازی کی بعض ناپختہ کوششیں بے نتیجہ رہیں۔

والدہ کی وفات کے بعد ۱۹۲۷ء میں مقبول صاحب والد صاحب کے ساتھ بمبئی منتقل ہوئے تو باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ پہلے ایک پرائمری اسکول میں پڑھا جہاں گجراتی بھی سیکھی اور اس کی بدولت ہندی کی چندی کرنے لگے یعنی اس میں بھی شُد بُد حاصل کرلی۔ پھر اردو کی چوتھی کلاس کا امتحان دیا۔ اس کے بعد والد نے گھر ہی پر انتظام

کر دیا کہ جلد عربی اور انگریزی سیکھ کر سینئر کیمبرج کا امتحان دیدیں۔ بخارا کے ایک مہاجر مولوی صاحب صبح عربی پڑھاتے تھے اور شام کو ایک ماسٹر انگریزی، اس مشغولیت میں کھیل کود کا موقعہ کبھی مشکل سے ملتا تھا۔ بخاری مولوی صاحب اصلاً ترک تھے اس لئے ان سے ترکی زبان کے چند جملے اور گنتی بھی سیکھی۔ ان سے عربی صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد مولوی عبدالعزیز بہاری سے کئی درسی کتابیں پڑھیں اور ایک حد تک درسِ نظامی ختم کر دیا۔ ان کے علاوہ دیگر علماء سے بھی مختلف کتابیں پڑھیں اور انگلستان جانے سے پہلے ایک عرب استاد شیخ سعداللہ مکی سے علم فرائض، قواعد تجوید اور دوسرے مضامین پڑھے۔ اس دوران اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ قضاۃ کے کاموں میں والد صاحب کا ہاتھ بٹانے لگے، کبھی نکاح پڑھا دیتے اور فارسی میں نکاح نامے اور دیگر دستاویزات تیار کر دیتے۔

میٹرک

گرانٹ روڈ ہائی اسکول

۱۹۳۳ء میں Popular High School میں داخلہ لیا لیکن اکبر حیدری صاحب کے مشورہ سے سینئر کیمبرج کا امتحان دلانے کے لئے پھر گھر پر تیاری کی رائے ہوئی، اس غرض سے ایک پرائیویٹ انسٹیوٹ Tisdall Hall, fort میں داخلہ لیا، ناتجربہ کاری اور پوری تیاری کے بغیر ۱۹۳۵ء میں لاہور جاکر امتحان دیا، ظاہر ہے کئی مضامین میں فیل ہونے کا داغ لگا۔

اسی دوران ۱۹۳۴ء میں انگریز فوجی افسروں کو فورٹ میں اردو پڑھانے کا موقعہ ملا تو اس بہانے ۱۹۳۷ء میں Oriental Languages Teachership Examination پاس کر لیا تھا۔

سینئر کیمبرج میں ناکامی کے بعد ایک سال دکن ہائی اسکول میں پڑھا، پھر

۱۹۳۷ء میں گرانٹ روڈ ہائی اسکول کی چھٹی جماعت میں داخلہ لیا، ۱۹۳۸ء میں ساتویں کلاس میں یعنی میٹرک پاس کر کے عربی کی اعلی تعلیم کے لئے جامعۃ الازھر مصر جانے کی خواہش ہوئی، نوجنیہ (گنّی / پونڈ) اسکالر شپ بھی مل گیا، دوسری طرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ کی تمنا تھی، لیکن بزرگوں نے مقامی تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کو ترجیح دی اور یہ دونوں خیال رد ہو گئے۔

انٹر میڈیٹ، بی اے، ایم اے

اسماعیل یوسف کالج، جوگیشوری، بمبئی

یہ کالج ۱۹۳۳ء میں قائم ہو چکا تھا، مذکورہ بالا رد و قدح کے بعد آخر کار ۱۹۳۸ء میں مقبول صاحب کا اس میں داخلہ ہو گیا، اس وقت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بذل الرحمٰن تھے اور اساتذہ میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی بھی تھے۔ ۱۹۴۰ء میں انٹر میڈیٹ پاس کرنے کے دوران مقبول صاحب بیمار رہے، بعد میں بھی صحت خراب رہی تو بمبئی سے باہر پڑھنے اور صحت بنانے کا خیال پیدا ہوا، اور اس کی تکمیل بہاء الدین کالج جوناگڑھ میں داخلہ سے ہوئی، مگر بمبئی کے مقابلہ میں وہاں نہ دل لگنا تھا نہ لگا، آخر پھر اسماعیل یوسف کالج بمبئی واپس ہوئے اور تعلیم جاری رکھی، اس وقت وہاں ان کے اساتذہ میں پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور ڈاکٹر حسین ہمدانی بھی تھے۔ ۱۹۴۲ء میں بی اے پاس کیا، کالج میں اول نمبر آیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا، ساتھ ہی ایم اے کے لئے کالج کی فیلوشپ بھی مل گئی جو اس زمانہ میں پچاس روپیہ ماہانہ تھی، اس کے علاوہ ان کو ہوسٹل کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی مقرر کر دیا گیا۔ ایم اے کے دوسرے سال ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ لا کالج میں بھی داخلہ لے لیا، اس وقت اس کے پرنسپل آصف علی فیضی تھے۔

ملک میں ہنگامہ خیز سیاست کا اکھاڑا قائم تھا، کالج کے طلبا کے ساتھ اس میں وقتی شرکت تو بی اے کی زمانہ ہی سے ہونے لگی تھی، اب اور بال و پر نکلے، گاندھی، نہرو

کی ہمنوائی اور ترقی پسند دوستوں کی رفاقت کی وجہ سے مسلم لیگی طلبا سے چھیڑ چھاڑ بڑھی، جو ان کو کمیونسٹ گردانے لگے، اگرچہ اس وقت تک All India Student Federation (IFS) کے تقسیم کردہ کمیونسٹ لٹریچر سے کوئی مثبت اثر نہ لیا تھا، لیکن کالج کے عمومی ماحول سے یہ ضرور ہوا تھا کہ خود مقبول صاحب کے بقول: روایت پسندی سے نکل کر Modernity میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا۔

بی لٹ، ڈی فل

سینٹ جانز کالج، آکسفورڈ یونیورسٹی

بہر حال ۱۹۴۴ء میں بمبئی یونیورسٹی سے اردو اور عربی میں ایم اے کی ڈگری بھی امتیاز کے ساتھ حاصل کی تو انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے سر کریم بھائی اسکالرشپ ملا، ڈاکٹر حسین ہمدانی نے Sir Hamilton Gibb کے نام مقبول صاحب کے داخلہ کے لئے خط لکھا اور ان کو St. John`s College, Oxford University میں داخلہ مل گیا۔

جنگ عظیم دوم کے خاتمہ (مئی ۱۹۴۵ء) سے پہلے کا انتشار و خلفشار عروج پر تھا، قیاس آرائیوں اور افواہوں کی گرم بازاری تھی، لیکن "علم و فکر کی معراج" (۲۶) کے مرکز سے استفادہ کا شوق یا وہاں کے حور و قصور کی افسانوی شہرت کا جادو یا دونوں کی لالچ نے پر پرواز بھرے اور ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

کے مصداق مقبول صاحب ۱۵ر جنوری ۱۹۴۵ء کو ملتان نامی بحری جہاز سے انگلینڈ کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ جہاز جگہ جگہ ہندوستانی فوجی رنگروٹوں کو اتارتا ہوا اور جنگی خطرات سے بچنے کے لئے ضروری اور غیر ضروری قیام کرتا ہوا ایک ماہ کے بعد ۱۸ر فروری

۱۹۴۵ء کی رات کو اسکاٹ لینڈ کے مغربی ساحل Greenock پر لنگر انداز ہوا۔ سیاسی رجحان اتنا حاوی ہو چکا تھا کہ انگلینڈ میں انڈیا لیگ کے کرتا دھرتا کرشنا مینن سے ملاقات کے لئے راتوں رات لندن روانہ ہو گئے۔ دن میں ان سے ملے اور ۲۰ فروری ۱۹۴۵ء کو آکسفورڈ پہنچے، چھٹیاں چل رہی تھیں، انگریزی رسم و رواج کے بر خلاف ازراہِ لطف و کرم پروفیسر گب نے ان کو دو ہفتے اپنے گھر مہمان رکھا، اس عرصہ میں انہوں نے اپنے آپ کو نہ صرف نئے موسم و ماحول اور انگریزی رسم و رواج سے سازگار کیا بلکہ اپنے استاذ کے مزاج و اطوار سے بھی واقف ہوئے، پھر ایک عمر رسیدہ خاتون کے ہاں کرایہ پر کمرہ مل گیا تو اس میں منتقل ہو گئے۔

چھٹیاں ختم ہوئیں، تیسرا ٹرم شروع ہوا تو گب صاحب نے از خود ریسرچ کے موضوع پر مقبول صاحب سے گفتگو کی اور ان کے لئے "اسلامی جغرافیہ" متعین کیا، پھر ایشمولین میوزیم لے جا کر وہاں موجود چند عربی کتابوں میں مسعودی کی مروج الذھب و معادن الجوھر نکال کر دی اور اس کے جغرافیائی مباحث کے انگریزی ترجمہ پر کام میں لگا دیا اور مقبول صاحب ان کو ہر ہفتے ترجمہ دکھانے لگے۔ ایک مرتبہ ان کے ہاں V.Minorsky بھی موجود تھے، انہوں نے ان سے نئے طالب علم کو متعارف کرایا، وہ مسعودی پر ریسرچ کا سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مقبول صاحب کو مسعودی کے بعض جغرافیائی تصورات بتائے۔ پھر Bachelor of Letters میں داخلہ کی تکمیلات ہوئیں اور گب صاحب کی سفارش پر کالج ہی میں ایک کمرہ مل گیا۔ ڈیڑھ سال کی محنت کے بعد کئی سو صفحات میں مروج الذھب کے متعلقہ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو گیا تو گب صاحب نے اس سارے مواد کو Classify کرنے کا حکم دیا، وہ مکمل ہوا تو یہ خوشخبری سنائی: مسٹر مقبول اب تمہارا ریسرچ شروع ہونے والا ہے! مقبول صاحب کے بقول پیروں تلے سے زمین نکل گئی ؎

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن ! Prof. Joseph Schacht کے سامنے اپنا دکھڑا بیان کیا، انہوں نے ریسرچ کے اس کام کو مسعودی کے جغرافیائی تصورات اور معلومات کے صرف مآخذ کی دریافت تک محدود کرنے کی صلاح دی، ایک نو آموز طالبعلم کے لئے یہ خود ایک بڑا کام تھا۔

بہر حال مقبول صاحب نے دن رات لگ کر یونانی، ایرانی، ہندی اور عرب جغرافیہ نگاروں، علم ہیئت کے ماہرین، فلاسفہ اور دیگر مصنفین کے مطالعہ سے یہ معلوم کرنے کی انتھک کوشش کی کہ مسعودی نے کس کس مصنف سے کون کون سی معلومات کس حد تک اخذ کی ہیں، کہاں تک ان سے اختلاف کیا ہے اور کیوں؟ جن لوگوں کو ریسرچ کا تجربہ ہے ان کو اندازہ ہوگا کہ بڑے سے بڑا مشکل کام محنت و لگن سے تکمیل کو پہنچ جاتا ہے، یہی کچھ مقبول صاحب کے ساتھ ہوا اور چھ ماہ میں "جغرافیہ نگاری میں مسعودی کا حصہ" پر ایک مختصر مگر جامع رسالہ تیار ہو گیا، وائیوا میں گب صاحب کے ساتھ کالج ہی کے ایک جغرافیہ داں استاد موجود تھے، یہ مرحلہ بھی کامیابی سے انجام کو پہنچا اور ۱۹۴۷ء میں ان کو B.Litt کی ڈگری مل گئی۔

اس کے بعد Doctor of Philosophy کے لئے مقبول صاحب کے ایک ہمعصر مصری طالبعلم محمد حسین زیّات کی تجویز سے پروفیسر گب نے اتفاق کیا کہ شریف ادریسی کی نزھة المشتاق فی اختراق الآفاق کے ہندوستان سے متعلق حصوں کی ایڈٹنگ، انگریزی ترجمہ اور اس پر حواشی تیار کئے جائیں۔ اس موضوع پر کام کرنے کے لئے ۱۹۴۷ء ہی میں مقبول صاحب کا داخلہ ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۵ء میں پہلی بار لندن پہنچتے ہی کرشنا مینن کے دفتر میں Miss Audrey سے شناسائی کو اب جنم جنم کے رشتہ میں تبدیل ہونا تھا، اس لئے ملازمت کی تلاش ہوئی، خوش قسمت تھے کہ BBC لندن کے اردو سیکشن میں وہ مل گئی تو ملازمت اور شادی دونوں مجبوریوں کی وجہ سے لندن میں قیام ضروری ہو گیا، اس لئے ریسرچ کا سارا کام وہیں انجام دیا اور تین چار سال کی محنت سے

۱۹۵۱ء کی ابتدا میں "ادریسی کی تصنیفات میں ہندستان کا بیان" پر رسالہ پیش کر دیا۔ گب کے علاوہ منور سکی بھی ممتحن تھے اور وائیوا میں موجود تھے، کامیاب ہوئے اور D.Phil کی ڈگری مل گئی۔ چھ سال اسلامی جغرافیہ پر مسلسل کام کرنے کے بعد اس موضوع سے ان کی مناسبت اور دلچسپی اتنی بڑھ گئی کہ پھر وہ ساری عمر کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا!

ریسرچ کے دوران فوری مادّی منافع کی لالچ سے طبیعت اتنی یکسو رہی کہ معقول ملازمتوں کی پیشکش بھی اس میں خلل ڈالنے کے لئے تیار نہ کر سکی۔ موجودہ آغاخان کے دادا دارالسلام (زنجبار) میں ایک Islamic Institute قائم کرنا چاہتے تھے، آصف علی فیضی صاحب سے مشورہ کیا، انہوں نے مقبول صاحب کا نام تجویز کیا، ڈی فل کے دوران ۱۹۴۸ء میں آغاخان نے مقبول صاحب کو مارسیلز (فرانس) بلا کر اس منصوبہ پر گفتگو کی اور اس میں کام کی پیشکش کی، متاہلانہ زندگی کی ذمہ داریوں اور مالی ضرورتوں کے باوجود مقبول صاحب پر ریسرچ کی تکمیل کا رجحان غالب رہا اور انہوں نے ڈی فل کی تکمیل کے بعد مدد کا وعدہ کر کے اس وقت معذرت کی۔ پھر ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ عربی میں ایک سینئر لیکچرر کی جگہ خالی ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے بی لٹ اور ڈی فل کی بنیاد پر تنخواہ کے فرق کا ذکر کیا، اس وقت بھی مقبول صاحب نے تکمیل ریسرچ کے بعد ہی ملازمت پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اس سے فراغت کے بعد پروفیسر گب سے مشورہ ہوا، انہوں نے ہندوستان سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ہجرت پاکستان کے پیش نظر علی گڑھ کی خدمت کو اوّلین اہمیت دی۔ پورے چھ سال بعد فروری ۱۹۵۱ء میں بمبئی واپس پہنچے تو ان کے استاد محمد ابراہیم صاحب ڈار (وفات ۱۹۵۳ء بعمر ۴۹ سال) نے بھی مقبول صاحب کے لئے علی گڑھ ہی کو مناسب تصور کیا ورنہ وہ بمبئی کی چاہت میں اپنے مادر علمی اسماعیل یوسف کالج کی خدمت کی طرف مائل تھے۔

آزادی ہند کا پہلا تلخ تجربہ

انگلینڈ سے چلتے چلاتے نئے آزاد ہندوستان میں سرکاری سطح پر فرقہ وارانہ تعصب اور سیاسی رواداری کے فقدان کا تلخ تجربہ اس وقت ہوا جب کہ ہائی کمشنر کرشنا مینن کی سفارش کو نظرانداز کرتے ہوئے انڈین ہائی کمیشن نے مقبول صاحب کو پاسپورٹ کے بجائے صرف Single Journey Permit دیا اور بمبئی پہنچنے پر سی آئی ڈی نے جی بھر کر تلاشی لی۔ "آپ بیتی" میں مقبول صاحب نے اپنے اس تلخ احساس کا صفائی سے اظہار کیا ہے کہ یہ زیادتی ان کے مذہب اور لندن میں سیاسی سرگرمیوں کا خمیازہ تھی! جو ایک آزاد خیال نیشنلسٹ کے لئے سخت مایوس کن تھی، اس کی پاداش میں مقبول صاحب لندن میں مقیم اپنی بیگم اور بچی کی ملاقات سے محروم ہوگئے! پھر ۱۹۵۳ء میں دوبارہ کرشنا مینن (جو اس وقت اقوام متحدہ میں ہندوستان کے نمائندہ تھے) ہی کے واسطہ سے اس وقت پاسپورٹ ملا جب کہ بیوی اور بچی ہندوستان آچکی تھیں اور اس کی فوری ضرورت نہیں رہی تھی۔ اہم ترین روابط رکھنے والے ترقی پسند، قوم پرست مسلمانوں کا جب یہ حال تھا تو ان کا کیا حشر ہوتا ہوگا جن کا کوئی والی وارث نہ ہو؟!!

فصل سوم

اہل و عیال

شادی خانہ آبادی

پہلے مختصراً ذکر آچکا ہے کہ اسکاٹ لینڈ میں جہاز سے اترتے ہی مقبول صاحب کرشنا مینن سے ملنے کی غرض سے ۱۹ر فروری ۱۹۴۵ء کو ایک دن کے لئے لندن گئے تھے، ان کے ساتھ ایک انگریز صاحبزادی آڈری سے بھی ملاقات ہو گئی، یہ آرٹس کی طالبعلم تھیں اور انڈیا لیگ میں بھی کام کرتی تھیں، کرشنا مینن سے بے تکلف تھیں اور ان کو پہلے نام کرشنا سے مخاطب کرتی تھیں، کسے معلوم تھا کہ یہ سرسری ملاقات جنم جنم کی رفاقت میں بدلنے والی ہے! ان سے شناسائی ہوئی تو مقبول صاحب بھی انڈیا لیگ کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لینے اور ہاتھ بٹانے لگے، دوستی بڑھی تو ساتھ سیر و تفریح ہونے لگی، مزید انسیت اور اعتماد قائم ہوا تو ساتھ تفریحی سفر ہونے لگے، چنانچہ ''آپ بیتی'' میں مقبول صاحب نے خود لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں آکسفورڈ یوتھ ہوسٹلز کی رکنیت کی بدولت اپنے ایک دوست محمد رمضان، آڈری (بعد میں بیگم مقبول) اور ان کی ایک سہیلی مس روتھ کے ساتھ ایک پیدل سفر اسکاٹ لینڈ کا کر ڈالا، جس میں مشرقی انگلستان کے کئی شہر دیکھے اور گلاسگو سے لیک ڈسٹرکٹ ہوتے ہوئے لندن پہنچے۔ پھر آڈری کے ساتھ دوسرے سفر میں Wells اور Bath گئے۔ بی لٹ تک انسیت چاہت میں تبدیل ہو چکی تھی تو ایک جان ہونے کی نوبت آگئی۔ گھر بسانے سے پہلے اضافی آمدنی کی فکر ہوئی۔ قسمت کا ستارہ عروج پر تھا، حسب خواہش BBC کی اردو سروس میں ملازمت مل گئی، یہاں سے نو پونڈ فی ہفتہ تنخواہ ملنے لگی جو اس زمانہ میں کافی بڑی رقم تھی۔ تمام حالات سازگار ہوئے تو والد صاحب سے منظوری حاصل کرنے کا مسئلہ

سامنے آیا جو کٹھن تھا، مگر امر واقع کے سامنے کس کی چلتی ہے؟ خواہی نخواہی اجازت ملی، تو انگلینڈ کے معمول کے مطابق چند دوستوں کے ساتھ ۱۴ر نومبر ۱۹۴۷ء کو متعلقہ آفس جاکر رجسٹریشن کرالیا، ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جاکر کیک کھایا، کافی پی، اللہ اللہ خیر صلا! شادی پکی ہوگئی اور ساتھ رہنے لگے۔ شادی نامہ نمبر MB028699 مورخہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۷۳ء میں شادی کے وقت مقبول صاحب اور ان کی بیگم سے متعلق یہ بیانات درج ہیں:

نام	سید مقبول احمد	Audrey Joan Lunger
عمر	اٹھائیس سال	اکیس سال
حالت	غیر شادی شدہ	ناکتخدا
حیثیت یا پیشہ	پروگرام اسسٹنٹ BBC	آرٹس اسٹوڈنٹ
ساکن	62-Abingdon Villas-W.8	Coningsby Road- N.4
ولدیت	سید محبوب شاہ	Ramsey Lunger
حیثیت یا پیشہ	قاضی	ٹیلیفون انجینیر

کہا جاتا ہے کہ بیگم کی ۱۹۵۳ء میں ہندوستان آمد کے بعد کسی وقت بمبئی کے اعزہ نے اسلامی طریقہ پر رسوم نکاح وغیرہ بھی انجام دی تھیں۔

بیگم مقبول آڈری احمد (ولادت ۱۹۲۵ء)

شادی کے وقت بیگم مقبول School of Salovenic and European Studies لندن یونیورسٹی میں سینٹرل ایشیا پر Ph.D کے لئے ریسرچ کر رہی تھیں۔ جس کے لئے پروفیسر منورسکی سے بھی صلاح و مشورہ کرتی رہتی تھیں۔ زیادہ دن نہ

129366

گذرے تھے کہ پہلی بیٹی زہرہ بانو پیدا ہو گئیں، اس لئے نیا جوڑا مائیکہ (واقع فنز بری پارک) میں منتقل ہو گیا، جہاں دوستوں کے اصرار پر بچی کی ولادت کی خوشی میں دعوت (عقیقہ) بھی کرنی پڑی۔ زہرہ کی عمر چھ ماہ کی ہو گی کہ ریسرچ کے سلسلہ میں بیگم مقبول کو Helsinki جانا پڑا، مجبوراً زہرہ کو مسز پال کے پاس چھوڑا جنہوں نے بہت خوبی سے ان کی دیکھ بھال کی، مقبول صاحب بھی بیٹی کو دیکھنے آتے جاتے رہے۔ اُدھر بیگم مقبول نے مذکورہ سفر میں Finish زبان بھی سیکھی لی، ان کو زبانیں سیکھنے کا خداداد ملکہ تھا، وہ اسپینش، فرنچ، اٹالین، پولش، ہنگیرین، سولو، کراویٹ، چغتائی، ترکی، ذارسی اور کئی دیگر یوروپین زبانیں جانتی تھیں، ہندوستان آمد پر اردو بھی سیکھ لی تھی۔ بہر حال ۱۹۵۳ء میں انہوں نے اپنے ریسرچ کا کام بعنوان Socio-Economic Expansion of Czarist Russia in Central Asia in the Second Half of the Nineteenth Century. مکمل کر کے لندن یونیورسٹی سے Ph.D. کی ڈگری حاصل کی، مقبول صاحب کی طرح پروفیسر منورسکی ان کے بھی ممتحن تھے، اس لئے انہوں نے ظرافت سے مقبول صاحب کی کتاب India and the Neighbouring Territories کی تقریظ میں خود کو ابوالدکتورین (دو ڈاکٹروں کا باپ) لکھا ہے۔

Ph.D کے بعد لندن میں قیام کی ضرورت نہ رہی، اس لئے بیگم مقبول نے برٹش میوزیم لندن کی ملازمت ترک کی جہاں وہ سینٹرل ایشیا سیکشن کے انچارج کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔ خشکی کے راستہ سے ترکی، پاکستان اور دیگر ممالک ہوتی ہوئی وہ زہرہ کے ساتھ ہندوستان پہنچیں۔ کراچی میں اپنے سسر محترم اور ان کے اہل و عیال سے بھی ملاقات کی۔ علی گڑھ میں ابتدائی قیام "سفینہ" اور اس کے بعد "بیت الحبیب" (اللہ والی کوٹھی) میں رہا۔

وہ روسی تاریخ و ادب اور زبان کی ماہر تھیں اس لئے ان کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ انگلش کے ماتحت روسی زبان پڑھانے کا موقع ملا۔ اسی دوران شعبۂ تاریخ کے

لئے انہوں نے ہندوستان سے متعلق بعض روسی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا جو تاحال شائع نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ میں اپنی حیثیت سے مطمئن نہ تھیں، روسی زبان کے ابتدائی کورس کو سالانہ بار بار پڑھانے سے بھی اکتا گئی تھیں۔ آخرکار ریسرچ اور موضوع کی مناسبت ۱۹۵۸ء میں ان کو Indian School of International Studies نئی دہلی لے گئی، جہاں اس کے شعبہ Central Asian Studies میں بحیثیت ریڈر ان کا تقرر ہو گیا تھا۔ معمول کے مطابق ریسرچ اور تعلیم و تدریس کی ذمہ داریوں کے ساتھ وہاں اساتذہ کے لیکچرز بھی ہوتے تھے جن میں وہ بھی حصہ لیتی تھیں۔ ان کے نمونہ ریسرچ اور اسلوب تحریر کے مطالعہ کے لئے خوش قسمتی سے ایک مطبوعہ مقالہ Middle Asia From 1700 to 1850 علی گڑھ میں دستیاب ہے، اس میں انہوں نے مذکورہ مدت کی سوویت جمہوریہ ریاستوں: ازبکستان، تاجکستان، کرغیزیا، ترکمانستان، اور جنوبی کزاخستان کے پڑوسی علاقوں کی تاریخ اور سیاسی، سماجی، معاشی حالات کا جائزہ لیا ہے۔(۲۷) بہر حال دو سال کے اندر ہی دہلی میں ان کے دو جڑواں بیٹیاں: جنیفر (فرحانہ) اور کرن (رخسانہ) پیدا ہوئیں تو ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ واپس آکر بحیثیت ریڈر پھر روسی زبان پڑھانا شروع کی۔ اسی زمانہ میں مقبول صاحب کو یونیورسٹی مکان (عظمت الٰہی زبیری کوٹھی) ملا، بیگم نے اس کو بچیوں کی خوش قسمتی پر محمول کرتے ہوئے اس کا نام "زرفشاں" رکھا جس میں مقبول صاحب ریٹائرمنٹ تک رہے۔

بیگم کو غالباً خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی تھی۔ ۱۹۶۲ء میں مسلم یونیورسٹی میں میڈیکل کالج کھلا تو MBBS میں داخلہ کا شوق پید ہوا اور سینگھ کٹا کر پھر طلبا میں شامل ہو گئیں، اب یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑنے سے تنگدستی کا دور دورہ ہو تو ان کی بلا سے! دھان پان لمباقد، حافظہ تیز، ترکیز کی نعمت نصیب، جوانوں جیسا عزم و حوصلہ، اس پر بلا کی محنتی اور کیا چاہئے کسی "آہنی خاتون" کو کرشمے دکھانے کے لئے؟! جڑواں بچیوں

کو گود میں دودھ پلاتی جاتیں اور نئے نئے مضامین کا عمیق مطالعہ جاری رہتا، ساڑھے سات سال کی مدت میں اس بے مثال محنت سے MBBS میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور چھ مضامین میں سے پانچ کے امتیازی تمغے گویا لوٹ لئے، اور بڑے بڑے سورما طلبا حسرت کے ساتھ ہاتھ ملتے رہ گئے!

اس کے بعد بھی چین کہاں، آرام کہاں؟ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے

MD کے لئے Post-Graduate Institute چنڈی گڑھ چلی گئیں، مگر وہاں انگلینڈ سے MRCP کرنے کا خیال ستانے لگا، سب چھوڑ چھاڑ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۱۹۷۰ء ہی میں لندن کا رخ کیا، جڑواں بچیاں ساتھ تھیں، ابتدائی زندگی تنگ و ترش تھی، لیکن ان کے پہاڑ جیسے عزم کے سامنے کوئی رکاوٹ ٹکتی نہ تھی:! جولائی ۱۹۷۳ء کے آخر میں مقبول صاحب جب پیرس میں ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد اہل و عیال سے ملنے لندن پہنچے ہیں تو بیگم MRCP کر چکی تھیں، College of Surgeons لندن میں Neurology کی ایک فیلوشپ مل چکی تھی اور اکٹن ٹاؤن میں قیام تھا۔

اس کے بعد Ealing Hospital لندن میں ملازمت ملی، کچھ عرصہ بعد سابق مکان چھوڑنا پڑا تو ۱۹۷۵ء میں ہسپتال کے قریب علاقہ میں ذاتی مکان خریدا(۲۸)، اس زمانہ میں مقبول صاحب اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کی دوسالہ فیلوشپ (۷۴-۱۹۷۶ء) کے ضمن میں لندن میں مقیم تھے، ظاہر ہے لندن میں ذاتی مکان خرید لینا آسان نہ تھا، اگرچہ بیگم نے بلڈنگ سوسائٹی سے قرض لیا تھا، لیکن مطلوب رقم کی کمی کو پورا کرنے کے لئے مقبول صاحب کو بھی اپنے وسائل استعمال کرنا پڑے۔ بہر حال اس ذاتی مکان میں یہ لوگ بیس اکیس برس رہے، مقبول صاحب حسبِ موقع و محل طویل و قصیر قیام کے لئے بہال دوسال میں آتے جاتے رہے، ان کے بیرونی اسفار کی کثرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس بہانے اہل و عیال سے ملاقات ہو جاتی تھی اور لندن

کی مشہور لائبریریوں میں علمی کام کا موقعہ بھی مل جاتا تھا، پھر کینسر کی بیماری کے آخری دوسال کا زیادہ عرصہ اسی مکان میں قیام رہا، یہاں تک کہ بیگم کے ریٹائرمنٹ اور بچیوں کے انگلینڈ کے مختلف مقامات پر بود وباش اختیار کر لینے کے بعد اس مکان میں تنہا بوڑھے میاں بیوی کے قیام کی ضرورت نہ رہی تو اس مکان کو بیچ دیا(۲۹) اور دونوں بیٹی جنیفر کے نئے بڑے مکان (۳۰) واقع شہر Windermere میں مستقل قیام کی نیت سے منتقل ہوگئے جو لندن سے کوئی تین سو میل شمال کی طرف واقع ہے۔

بہر حال اس طویل جملہ معترضہ کے بعد پھر ہم بیگم مقبول کی ترقی اور امتیازی صفات کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ غالباً ۱۹۷۷ء میں ان کو Geriatrics کے ماہر کی حیثیت سے ترقی ملی اور اس نئے عہدہ پر چودہ سال کام کیا، اس طرح تقریباً بیس سال کی میڈیکل سروس کے بعد ۱۹۹۱ء میں بعمر پینسٹھ سال ریٹائر ہوئیں۔ ان کی خدمات کے صلہ میں حکومت برطانیہ نے سالانہ وظیفہ مقرر کیا، برٹش میڈیکل اسوسی ایشن نے FRCP کی اعزازی ڈگری عطا کی، ۲۳/اگست ۱۹۹۱ء کو Ealing میں ایک الوداعی جلسہ ہوا جس میں اس علاقہ کے لوگوں نے اپنی قدر دانی اور محبت کا مظاہرہ کیا اور اس موقعہ پر وہاں کے میئر اور ان کی بیگم نے بھی اپنی شرکت سے چار چاند لگائے۔ اہل علی گڑھ نے اگر خود اپنی آنکھوں سے ظاہری طور پر اس دبلی پتلی، دارز قد، ضعیف بلکہ نقاہت سے چور پیکر کو نہ دیکھا ہوتا تو کوئی مشکل ہی سے باور کر سکتا تھا کہ وہ اس آہنی عزم وارادہ کی خاتون ہیں۔

اولاد واحفاد

مقبول صاحب اور ان کی بیگم کی کل تین صاحبزادیاں ہیں: زہرہ، جنیفر اور کرن۔ ان کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

ڈاکٹر زہرہ بانو

زہرہ کی ولادت لندن میں ہوئی، پانچ سال کی عمر میں والدہ کے ساتھ ہندوستان آئیں، ان کی تعلیم وتربیت علی گڑھ اور دہلی میں ہوئی، ۱۹۵۵ء میں وہ یونیورسٹی

گرلس اسکول علی گڑھ میں داخل ہوئیں، ۱۹۵۸ء میں والدہ کو بغرض ملازمت دہلی جانا پڑا تو تقریباً دو سال وہاں کے کسی اسکول میں تعلیم ہوئی، اس کے بعد پھر علی گڑھ میں داخلہ لیا اور یہیں سے ہائی اسکول اور پری یونیورسٹی کیا، پھر All India Institute of Medical Sciences نئی دہلی میں داخلہ ہو گیا تو وہاں سے MBBS اور MD کی ڈگریاں حاصل کیں۔

وہ ہندوستانی حسن و جمال اور انگریزی رنگ و روپ کے خوشگوار امتزاج کا حسین ترین شاہکار تھیں، والدین کی طرح ذہین و فطین اور شہسواری کی خاندانی وراثت کی امین تھیں۔ بچپنے سے ان کو اس فن کا شوق تھا اور مسلم یونیورسٹی Riding Club میں عملی حصہ لینے کا خوب موقع ملا تھا، اس میں انہوں نے اتنی شہرت اور نام کمایا کہ ایک زمانہ میں یونیورسٹی کے ہر قابل ذکر جشن میں شہسواروں کے دستہ پیشیں کی ناگزیر رکن سمجھی جاتی تھیں اور تماشائیوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی تھیں۔

آزاد خیالی اور بیباکی میں بھی اپنے ترقی پسندانہ ماحول میں کسی سے کم نہ تھیں۔ ایک زمانہ میں ہندوستانی معاشرہ میں عورتوں کی درگت کے خلاف قومی اخبارات و رسائل میں انگریزی میں مراسلہ بازی بھی شروع کی تھی جو جلد ہی ٹھنڈی پڑ گئی، شاید اس لئے کہ انہوں نے ملک کو ہی خیر باد کہہ دیا تھا۔

دہلی میں زمانۂ تعلیم کے آخر میں ملیشیا کے ایک رفیق درس سدھو سے شادی کرلی تھی، والدین نے بظاہر خوشی خوشی علی گڑھ (۲۵/دسمبر ۱۹۶۹ء) اور دہلی میں دو استقبالیے دیئے۔ اس شادی کی یادگار ایک بچی زرینہ بانو (۳۱) ۱۹۷۰ء میں پیدا ہوئیں، پھر تکمیل تعلیم کے بعد وہ مع نومولود بچی کوالالمپور (ملیشیا) چلی گئیں جہاں ان کے شوہر پہلے ہی جا چکے تھے، لیکن مذہبی تفاوت اور سماجی اختلاف کی وجہ سے یہ رشتہ زیادہ دن نہ چل سکا اور جلد ہی علیحدگی کی نوبت آگئی۔

جدائی کے بعد بھی وہ تقریباً دس سال کوالالمپور میں قیام پذیر رہیں، وہاں وہ

Health Service of Schools سے وابستہ تھیں۔ مقبول صاحب اپنے ریٹائرمنٹ (۱۹۷۹ء) سے پہلے زہرہ اور نواسی زرینہ سے ملنے کوالالمپور گئے تھے اور اسی وقت ان کی بیگم بھی لندن سے وہاں پہنچ گئی تھیں۔ شاید اس موقعہ پر انہوں نے بیٹی کو مشورہ دیا کہ وہ کوالالمپور کو خیرباد کہہ کر والدہ کے ساتھ لندن میں قیام اختیار کریں۔ بہر حال کچھ عرصہ کے بعد وہ لندن منتقل ہو گئی تھیں۔

ہندوستانی اعزہ کو زہرہ کی تنہائی کی فکر تھی، زہرہ کے لندن منتقل ہونے کے بعد انہوں نے کویت میں مقیم بڑودہ کے ایک مسلم ڈاکٹر شوکت سے ان کی دوسری شادی کرادی، یہ بزرگوار بھی برٹش شہریت حاصل کرنے کے بعد ان سے دستبردار ہو گئے اور ایک صاحبزادی زاہدہ بانو عرف زازا (۳۲) اپنی یادگار چھوڑ گئے جو زیر تعلیم ہیں۔ خدا کرے زہرہ اب اپنے موجودہ شوہر طارق جاوید کے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم رہیں۔ (۳۳)

جنیفر عرف جینی، اسلامی نام فرحانہ:

Jennifer دہلی میں جڑواں بہن kiran کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں پیدا ہوئیں، ان دونوں کی ولادت کی وجہ سے والدہ نے دہلی کی ملازمت چھوڑی اور علی گڑھ واپس آ گئیں، کچھ عرصہ بعد والدہ کی MBBS کی تیاری میں زیادہ انہماک کو دیکھتے ہوئے قدرتاً مقبول صاحب کی توجہ ان دونوں کی طرف زیادہ تھی، خصوصاً قیام شملہ (۶۶-۱۹۶۷ء) کے دوران تو گویا مقبول صاحب ہی نے ماں باپ کا کردار ادا کیا، شملہ میں دونوں لارٹیو کانونٹ کے ہوسٹل میں داخل تھیں، واپسی پر لیڈی فاطمہ اسکول علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم جاری رہی، ۱۹۷۰ء میں والدہ کے ساتھ لندن منتقل ہونے کے بعد ان دونوں کی تعلیم لندن میں شروع ہوئی، ۱۹۷۳ء میں جب مقبول صاحب بیگم اور بچیوں سے ملنے لندن گئے تھے تو یہ دونوں ایکٹن اسکول میں پڑھتی تھیں، اس کے بعد ان کی تعلیم کی تفصیل میرے علم میں نہیں۔

بہر حال دسمبر ۱۹۹۰ء میں مقبول صاحب کے سفر لندن کے وقت جنیفر اپنے

پیروں پر کھڑی ہو چکی تھیں، ان کا ہوٹل کا بزنس تھا، ان کے ہوٹل یا مہمان خانہ کا نام Ashleigh Guest House ہے، اس میں مقبول صاحب کے مطابق انہوں نے ترمیمیں کر کے اس کو خوب سجالیا ہے۔ اس معاملہ میں مقبول صاحب ان کی ماہرانہ صلاحیتوں کے بہت قائل تھے۔ ملکی اور غیر ملکی سیاحت کے موجودہ زمانہ میں یہ بہت نفع بخش تجارت ہے اور یہ ہوٹل خوب چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا وسیع اور آرام دہ گھر ہے (۳۴) جہاں ۱۹۹۶ء کے اواخر میں ان کے والدین مستقل رہائش کے لئے منتقل ہو گئے تھے۔

جنیفر کی شادی ہو چکی ہے، ان کے شوہر کا نام Martin Bowles ہے، ان کے ہاں پہلے ایک بچی اور بعد میں ایک لڑکا (غالباً صوفی دسمبر ۱۹۹۴ء اور جیمی اکتوبر ۱۹۹۶ء) تولد ہوا، جس کی وجہ سے قدرتاً اس چھوٹے سے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اس میں یہ پہلی اولاد نرینہ تھی۔

کرن عرف کیری، اسلامی نام رخسانہ

کرن کی تعلیم و تربیت کے حالات ان کی جڑواں بہن جنیفر کے بیان میں اوپر گذر چکے ہیں۔ آرٹس کی تعلیم مکمل کر کے ایک اچھی آرٹسٹ بن چکی ہیں، مقبول صاحب ان کو متعدد خداداد صلاحیتوں کی حامل فنکارہ (Versatile Artist) کہا کرتے تھے، کچھ عرصہ والد کی طرح BBC سے بھی وابستہ رہی ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ کام کی نوعیت مختلف تھی، اب لندن میں پینٹنگ وغیرہ کا آزاد کام کرتی ہیں (۳۵)۔ مقبول صاحب کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کی امین معلوم ہوتی ہیں، وہ بچوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے ساتھ کھیلتے کھیلتے پنسل سے برجستہ اسکیچ و خاکے اور مناظر و تصویریں بے تکلف بنا دیتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کو کبھی اس فن سے بھی لگاؤ رہا تھا۔

حواشی

۱۔ خاندان کے قدیم حالات کا ماخذ مقبول صاحب کی غیر مطبوعہ خودنوشت سوانح حیات ہے، آئندہ اس کا تذکرہ صرف "آپ بیتی" سے آئیگا۔ بیسویں صدی کے افرادِ خاندان کے حالات کی تکمیل ونی (ناگپور) اور بھوپال میں مقیم ان کے بعض اعزہ کے زبانی بیانات سے بھی کی گئی ہے۔ ان تحریری اور تقریری بیانات کی تلخیص میں غلط فہمیوں کے در آنے کا احتمال رہتا ہے، کسی کی دلآزاری یا حق تلفی نہ ہو اس لئے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

۲۔ رفیقہ کثیر العیال تھیں، اگرچہ ان کی یادگار صرف ایک بچہ عبدالاحد ہی کو مہلت حیات ملی اور خود رفیقہ والد ماجد کی وفات کے چھ سات سال بعد داغ مفارقت دے گئیں۔

۳۔ سید محمد احمد Food Corporation of India, Bhopal میں ملازم تھے، ان کی وفات غالباً ۱۹۸۹ء میں ہوئی، ان کی یادگار صرف ایک بیٹی آصفہ جہاں ہے، ان کی شادی ان کے چچازاد بھائی سید لئیق احمد سے ہوئی جن کا تذکرہ نیچے آرہا ہے۔ سید محمد احمد صاحب کی بیوہ اب بھی مقبول صاحب کے مذکورہ بالا آبائی مکان ہی میں رہتی ہیں۔

۴۔ ماسٹر سید حبیب احمد (ولادت ۱۹۲۵ء) ریاست بھوپال اور اس کے مابعد کئی ملازمتوں پر مامور رہے، آخر میں طویل مدت حمیدیہ ہسپتال کے پیچھے واقع وحیدیہ اسکول میں گذاری اور ۱۹۸۳ء میں اس کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے پانچ بیٹے: لئیق احمد، عتیق احمد، صدیق احمد، توفیق احمد، خلیق احمد اور ایک بیٹی: سمینہ ہے۔ ان کا پتہ: 77-Sajida Nagar, Bhopal 462001 ہے۔ ان کے بیٹے سید لئیق احمد الہ آباد بینک کے صدر دفتر ٹی ٹی نگر، بھوپال کے منیجر ہیں۔ ان کا رہائشی پتہ: A-99,Housing Board Colony, Koh-e Fiza, Bhopal-462001 اور فون نمبر 546302 ہے۔

۵۔ سید محبوب احمد (ولادت تقریباً ۱۹۳۸ء) Venus Industries, Bhopal میں مشینوں کے ماہر ہیں، دیگر کمالات کے ساتھ شعر وادب سے دلچسپی رکھتے ہیں، ایک شعری مجموعہ "دست بستہ" زیر طبع ہے۔ ان کی اولاد میں پانچ لڑکے: عدنان، سلمان، فیضان، فرحان، فرقان، اور ایک بیٹی فائزہ ہے۔ ان کا رہائشی پتہ حاشیہ نمبر ۶ کے مطابق ہے۔

۶۔ پتہ: 13-Kabeetpura Road, Near IslamiGate, Shahjahanabad, Bhopal - 642001.

۷۔ حکیم سید شمس الدین نے طب کا آبائی پیشہ اختیار کیا، کچھ عرصہ بمبئی میں پریکٹس کے بعد اون (Wani) چلے گئے۔ برار کی ایک خاتون خورشید بیگم سے شادی ہوئی، ۱۹۸۵ء میں حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ ان کی اولاد میں چار صاحبزادے: ناصر الدین ایاز، بہاء الدین ریاض، آصف، ظفر اور دو لڑکیاں: نیلوفر اور نکہت ہیں۔

ایڈوکیٹ ناصر الدین ایاز کی اون (Wani) میں کامیاب وکالت اور بڑی کھیتی باڑی ہے۔ یہ مقبول صاحب کی بہن آفتاب بیگم عرف شہر بانو کے پروردہ اور ان کے معاون و مددگار ہیں، برسوں سے وہ مقبول صاحب کی خیر خبر لینے اور علی گڑھ یا دہلی سے ان کو ونی لانے لیجانے کے لئے ایاز صاحب ہی کو بھیجا کرتی تھیں، مقبول صاحب بھی ان سے بہت تعلق رکھتے تھے، آخر بیماری میں بھی ان کو مقبول صاحب کی تیمارداری کی سعادت ملی اور انہوں نے اولاد کی طرح اس کا حق ادا کیا، پھر وفات کے بعد وہی علی گڑھ میں مقبول صاحب کے کرایہ کے مکان اور سامان وغیرہ کا تصفیہ کرنے ۱۴-۲۰/اپریل ۱۹۹۸ء علی گڑھ آئے اور وصیت کے مطابق باقی ماندہ کتابیں لائبریری سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے حوالہ کیں۔ ان کی اولاد میں جمال الدین شاداب، نورالدین عمران اور ایک بیٹی عرشی ہیں۔

۸۔ بدرالدین اور صلاح الدین کی عہد طفولیت ہی میں وفات ہو گئی۔

۹۔ سید شریف الدین عرف باباکو چچا کی وصیت کے مطابق مقبول صاحب علی گڑھ لے آئے تھے، منٹو سرکل میں ہائی اسکول تک ان کی تعلیم ہوئی مگر امتحان سے پہلے کسی پریشانی میں والدہ نے ان کو گھر بلالیا، کچھ عرصہ بمبئی میں رہنے کے بعد دھامن گاؤں چلے گئے۔ وہاں شادی ہوئی اور ۱۹۸۵ء میں وہیں انتقال ہوا۔

۱۰۔ سیدہ مہربانو کی شادی احمد بھائی دیشمکھ (ساکن مہائم بمبئی) سے ہوئی، ۱۹۵۱ء میں مہربانو کو دق کا عارضہ ہو گیا تھا، دیشمکھ صاحب کا ۱۹/فروری ۱۹۸۹ء کو بمبئی میں انتقال ہوا۔ ان کے دو بیٹے: محمود خان، فیروز خان اور ایک بیٹی نکہت ہیں۔

۱۱۔ سیدہ قمر بانو کی اولاد میں اسلم اور شہناز دونوں شادی شدہ ہیں اور بمبئی کے مضافات میں

بھانڈوپ میں رہائش پذیر ہیں۔

۱۲۔ اس گھر کا موجودہ پتہ حاشیہ نمبر ۶ میں گزر چکا ہے، اس کی خستہ حالت مقبول صاحب نے اپنی غیر مطبوعہ "آپ بیتی" میں بھی بیان کی ہے۔ تقریباً پچھتر سال بعد ۱۶ر مئی ۱۹۹۸ء کو راقم نے اس گھر کی زیارت کی تو حیرت ہوئی کہ وہ اب تک علی حالہ باقی ہے، کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی احساس نہ ہوا۔

۱۳۔ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۴

۱۴۔ فریدہ بانو کی شادی عارض القادری سے ہوئی تھی، تقسیم کے بعد وہ دونوں لاہور چلے گئے تھے جہاں ان سے مقبول صاحب کی آخری ملاقات ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی۔ مقبول صاحب نے اپنی "آپ بیتی" میں لکھا ہے:

> "یہاں میں اپنی بہن فریدہ بیگم سے بھی ملا، جب میں ان کے یہاں پہنچا تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی، مگر یہ دیکھ کر بیحد افسوس ہوا کہ وہ بہت کمزور اور لاغر ہوگئی تھیں، غالباً تپ دق ہوگیا تھا، یہ میری دوسری والدہ کی اکلوتی بیٹی تھیں، کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔"

اس کے بعد ان کے شوہر بھی وفات پاگئے، ان کے دو لڑکے: محمد علی اور پپو کراچی میں ہیں۔

۱۵۔ پہلا سفر لاہور سینئر کیمبرج کا امتحان دینے کے لئے ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا۔

۱۶۔ ایڈوکیٹ ناصر الدین ایاز کے مطابق اس خاندان کی رہائش روبرو Daw Medical College بندر روڈ، کراچی ہے۔

۱۷۔ سید آفتاب احمد جوانی میں گھر چھوڑ کر گئے تو آج تک لاپتہ ہیں، کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں کسی ہوٹل کے منیجر ہیں۔ واللہ اعلم۔

۱۸۔ قاضی القضاۃ سید مہتاب احمد ایڈوکیٹ نے والد ماجد کے انتقال کے بعد دفتر قضاۃ کو سنبھالا اور اسی کے ساتھ بی اے اور ایل ایل بی کی تعلیم بھی مکمل کی، بمبئی ہائی کورٹ کے قابل ایڈوکیٹ ہیں اور اچھی پریکٹس ہے، دفتر قضاۃ کا پتہ یہ ہے:

259-Alka Mansion, Sir Rahmatullah Road, Near Mandavi Post,
Bhindi Bazar, Mumbai 400003

بمبئی کے ایک تعلیم یافتہ معزز خاندان کی دختر نیک اختر حمیدہ بیگم بنت شوکت علی عبداللہ الانا (آکسفن) سے شادی ہوئی۔ ان کا گھر ہی بمبئی میں مقبول صاحب کا ٹھکانہ تھا، جہاں اتفاق سے انہوں نے زندگی کا آخری عشرہ بھی گذارا اور ۲۱ر فروری ۱۹۹۸ء کو وہیں جان جان آفریں کے سپرد کی۔ پتہ یہ ہے:

B-23, Sheltor Building, Arvind Nagar, Kurlakaln Road, Santacroz Road, Bombay-400023 فون نمبر 022-6143877

ان کی اولاد میں ایک بیٹی صہبا اور ایک بیٹا سید معصوم احمد عرف عامر ہیں۔

۱۹۔ افسوس کہ ان دونوں حضرات کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

۲۰۔ شاہجہاں بیگم کی شادی ناصر الدین ایاز ایڈوکیٹ سے ہوئی جن کا ذکر حاشیہ نمبر ۷ میں گزر چکا ہے۔

۲۱۔ نور جہاں بیگم کی شادی عبدالسلام انصاری سے ہوئی، ان کے چار بچے بچیاں ہیں: فیروز، غزالہ، شہباز اور اظہر۔

۲۲۔ ممتاز جہاں بیگم کی شادی ناگپور کے ایک تاجر ایاز الوکیل سے ہوئی، ان کا ایک لڑکا توصیف اور ایک لڑکی عدلیہ ہے۔

۲۳۔ عبدالرؤف احمد صاحب، ڈاکٹر عبدالرزاق احمد صاحب کے صاحبزادے تھے، ان کے دادا خدا بخش یوپی سے ونی (برار) آکر آباد ہوئے تھے جو ناگپور سے اسّی میل / ۱۲۵ کیلو میٹر کی مسافت پر واقع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ونی ہی میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو ہوا، ان کے باقی چار لڑکوں اور گیارہ لڑکیوں میں سے جن کے نام اور حالات ہم کو معلوم ہو سکے ہیں یہ ہیں:

عبدالسلام (وفات ۱۲ر مئی ۱۹۶۴ء) کی پہلی بیوی سے شبیہ اور ممتاز فاطمہ پیدا ہوئے۔ دوسری بیگم نور جہاں سے اختر جہاں، نیر جہاں، رعنا نور، انور جہاں لڑکیاں اور عبدالمتین احمد اور عبدالرزاق احمد لڑکے پیدا ہوئے۔ رعنا نور کے شوہر محی الدین صدیقی مدھیہ پردیش میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ عبدالرزاق احمد (معین) Boston یونیورسٹی امریکہ میں Medicine میں ریسرچ کر رہے تھے۔ نیر جہاں نیّر شعر و ادب کی

دلدادہ بنگلہ دیش میں تھیں، ان کے ساتھ یہ دلدوز حادثہ پیش آیا کہ خانہ جنگی کے زمانہ میں بنگالی فوجیوں نے گھر میں گھس کر ان کے شوہر کو گولی مار دی، وہ ہلاک ہوگئے اور یہ ہوش و حواس کھو کر دیوانی، پھر عبدالرزاق ان کو اپنے ساتھ امریکہ لے گئے جہاں وہ اب آباد ہیں۔ شبیہ اور انور پاکستان میں ہیں۔

عبدالرشید (وفات مئی ۱۹۶۳ء) کی شادی جاورہ کی دبیر جہاں سے ہوئی تھی، ان کی اکلوتی لڑکی رضیہ کی شادی ڈاکٹر شمیم کے بھائی خضر سے ہوئی اور وہ پونہ میں رہتی ہیں۔ دبیر جہاں کے بھائی سلیم ونی میں اہل و عیال کے ساتھ آباد ہیں۔

بدرالنساء کی شادی بھوپال کے سید عبدالکریم (علیگ) عرف بابو میاں سے ہوئی تھی جو ریاست میں ششن جج تھے، بعد میں وہ بھوپال میونسپلٹی کے چیرمین منتخب ہوئے۔ بھوپال کے سفروں میں مقبول صاحب کا قیام ہمیشہ ان کے گھر (واقع شیخ بتی گلی، ابراہیم پورہ) پر ہوتا تھا۔ عبدالکریم صاحب کی وفات بھوپال میں شاید آٹھویں دہائی میں ہوئی ہوگی اور ان کی بیگم کی نویں دہائی میں انگلینڈ میں جہاں وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔ ان کے صاحبزادوں میں انعام الکریم اور عرفان الکریم اور صاحبزادیوں میں نوشانہ اور فیروزہ ہیں۔ ڈاکٹر انعام کی شادی توکن سے ہوئی اور ان کے تین بچے: خرم، ترنم اور خسرو ہیں۔ ڈاکٹر عرفان کی شادی نیلوفر سے ہوئی اور ان کے دو بچے، فیض اور تارہ ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد دونوں بھائی انگلستان چلے گئے اور وہیں پریکٹس کرتے ہیں۔

بھوپال میں عبدالکریم صاحب کے بھائی سید عبدالرحیم عرف دادامیاں بھی تھے، ان کا تعلق ریاست کے حاکم خاندان کے شاہی عملہ سے تھا اور احمد آباد، بھوپال میں رہتے تھے۔ کریم صاحب کے عزیزوں میں ایک وکیل عبدالرقیب (علیگ) بھی تھے جن سے مقبول صاحب کے بے تکلفانہ مراسم تھے، ان کو نوجوانی میں دمہ ہوگیا تھا اور آٹھویں دہائی میں کسی وقت اچانک انتقال ہوگیا۔

مہرالنساء کے شوہر سید مظہر علی جج تھے، ان کی اولاد میں ڈاکٹر محسن (مقیم حیدر آباد) اور تین لڑکیاں: مکرم، مسرور اور نیلوفر ہیں۔

نجم النساء کے شوہر اشفاق حسین تھے، ان کے چار بیٹوں: جاوید، خالد، ہمایوں اور نوید نے علی

گڑھ میں تعلیم پائی۔ جاوید اور خالد انجینیر ہیں اور ہمایوں ونو یدونی میں مقیم ہیں۔

۲۴۔ موجودہ پتہ: رزاق منزل، اون 445304(Wani)، ضلع ایوت محل (Yeotmal)، ودربھا، موجودہ مہاراشٹرا۔ فون نمبر 0723-925182

۲۵۔ ڈاکٹر شفاعت احمد (ارتھوپیڈک سرجن) ایم بی بی ایس کی تعلیم کے بعد امریکہ میں بس گئے، Dayton Beach Florida میں ذاتی کلنک اور اچھی پریکٹس ہے، امریکہ ہی میں Carol نامی ایک خاتون سے شادی کی، ان کے چار لڑکے: جیفری جلیل، کرسٹو فر رؤف، شان، مارک کمال اور تین لڑکیاں: نسیم، لاری اور شہلا ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال احمد (وفات ۱۲رد سمبر ۱۹۹۰ء) کی شادی حیدر آباد کی ڈاکٹر شمیم سے ہوئی اور وہیں سکونت اختیار کی، ان کی اولاد میں دو لڑکیاں: یاسمین اور حمیرہ کے علاوہ ایک لڑکا ندیم ہے۔ ڈاکٹر یاسمین کی شادی بمبئی کے ایک تاجر سمیع خطیب (وفات دسمبر ۱۹۹۰ء) کے صاحبزادہ ساحر سے ہوئی۔ حمیرہ اور ندیم زیر تعلیم تھے۔

۲۶۔ "آپ بیتی" میں مقبول صاحب نے اپنے سفر انگلستان کا یہی سرنامہ باندھا ہے۔

27- Bulletin of the Institue of Islamic Studies, Aligarh, Nos.2-3, 1958-59; pp: 1-25

28- 18-Granville Garden, Ealing Common London-N5 3PA(U.K)

۲۹۔ اس کا تذکرہ مقبول صاحب کے خط بنام ساجد مورخہ ۱۱رنومبر ۱۹۹۶ء میں ہے۔

ساجد عرف افروز خان مقبول صاحب کے خادم خاص عبدالملک خان کے چھوٹے بیٹے ہیں، مقبول صاحب کے یہاں اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے اس کو انہوں نے بڑے لاڈو پیار سے پالا پوسا، لیکن مقبول صاحب کے بار بار بیرونی اسفار اور ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ سے باہر ملازمتوں کی وجہ سے وہ ان کی توقع کے مطابق تعلیم حاصل نہ کر سکے، عرصہ سے سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے دفتر میں اپنے والد کی جگہ Office Attendent ہیں۔ مقبول صاحب کے بھتیجے ایڈوکیٹ ناصرالدین ایاز کے خط بنام ساجد مورخہ ۹رفروری ۱۹۹۸ء کے مطابق مقبول صاحب نے اپنی آخری بیماری میں ساجد کو حسب موقع ونی یا بمبئی بلایا تھا لیکن وہ بعض مشغولیتوں کی وجہ سے وفات سے صرف چھتیس گھنٹے پہلے ۱۹رفروری ۱۹۹۸ء کو شب میں بمبئی پہنچ سکے اور بقول ان کے

۲۱ر فروری، ۱۹۹۸ء کو ساڑھے دس بجے صبح مقبول صاحب نے ان کی گود میں دم توڑا۔
اناللہ وانا الیہ راجعون!

30- Blencathra, Park Road, Windermere, Cumbria- LA23 2DJ
(U.K.) Phone No. 015394-44887

۳۱۔ زرینہ بانو۔ سے مقبول صاحب کو علمی میدان میں ناموری حاصل کرنے کی توقع تھی، غالباً اسی امید پر انہوں نے اپنی عمر بھر کے سرمایۂ کتب کا تمام قابلِ ذکر حصہ دھیرے دھیرے انگلینڈ منتقل کر دیا تھا۔ باقیماندہ حصہ تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں اور رسالے ان کی وصیت کے مطابق سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کی لائبریری میں منتقل ہو چکا ہے۔ کچھ کتابیں ان کے بھتیجے ایڈوکیٹ ناصر الدین ایازونی (ناگپور) کے اسکول کے لئے لے گئے ہیں۔

۳۲۔ زاہدہ بانو عرف زازا کی تاریخ پیدائش مجھے معلوم نہ ہو سکی، غیر مطبوعہ "آپ بیتی" میں مقبول صاحب کے اسفار لندن کی روئداد میں ان کا نام ۱۹۸۹ء سے ملنا شروع ہوتا ہے، ظاہر ہے ان کی ولادت اس سے پہلے کی ہوگی۔

33- 13-Marlborough Road, South Hall, Middex UB2 5LW (U.K.)
Phone No. 0044-181-8138411

۳۴۔ جنیفر کا پتہ حاشیہ نمبر ۳۰ میں گذر چکا ہے۔

35- Bear Field Road, Kingston upon Thomes, Surrey- KT2 5EI
(U.K.)- Phone No. 0044-181-5463708

باب دوم

خدمات

فصل اول

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اعلی تعلیم کے لیے چھ سالہ قیام انگلینڈ (فروری ۱۹۴۵ء تا فروری ۱۹۵۱ء) کے بعد ہندوستان واپسی پر مقبول صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے منسلک ہوئے اور آخر زندگی تک کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہے۔

شعبہ عربی واسلامیات

۱۵/اگست ۱۹۵۱ء کو شعبۂ عربی میں سینئر لیکچرر عربی واسلامیات کی حیثیت سے مقبول صاحب کا تقرر ہوا، "آپ بیتی" میں ان کے بیان کے مطابق ان کی تقرری کے بعد ۱۹۵۱ء ہی میں شعبۂ عربی میں توسیع کر کے اس کا نام شعبۂ عربی واسلامیات رکھدیا گیا تھا، اس شعبہ کے صدر پروفیسر عبدالعلیم (ا) صاحب تھے۔ ۱۹۵۴ء میں مقبول صاحب ریڈر کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ہر دو حیثیتوں میں ایک حوصلہ مند جوان مدرس و محقق کی طرح اس کی تدریسی و تحقیقی خدمات دلجمعی سے انجام دیں۔ ایک قدیم Bio-Data میں علی گڑھ اور دوسری تعلیم گاہوں میں مقبول صاحب کے ماتحت ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے طلبا کی تعداد تیس لکھی ہے۔

ادارہ علوم اسلامیہ

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک پر ۱۹۵۴ء میں ادارہ علوم اسلامیہ کا قیام عمل

میں آیا، مقبول صاحب کے بیان کے مطابق اسی سال شعبۂ عربی و اسلامیات اور ادارہ علوم اسلامیہ ایس ایس ہال سے ظہور وارڈ منتقل ہوا اور نئی تقرریوں کی وجہ سے ایک اچھی علمی فضا قائم ہوگئی۔ پروفیسر عبدالعلیم صاحب اس ادارہ کے بھی اعزازی ڈائرکٹر تھے اور ان کی بھاری بھرکم شخصیت کی وجہ سے تمام اساتذہ و عملہ مل جل کر کام کرتے تھے۔ مقبول صاحب نے نئی تقرریوں کے بعد آپ بیتی میں لکھا ہے:

> "اب اس ادارہ میں تحقیق و تدریس کی فضا قائم ہوگئی اور مختلف اسکالرز کی تصنیفات شائع ہونے لگیں۔ سیمینار، جلسے اور علمی صحبتیں منعقد ہونے لگیں، یہاں دانشمندوں اور خرد مندوں کا ایک مجمع تھا جو اس زمانہ میں سوائے شعبۂ تاریخ کے اور کہیں نظر نہیں آتا تھا، اس کی اپنی ایک کشش تھی!"

مقبول صاحب جب تک دل برداشتہ نہ ہوئے تھے اس کی تمام علمی و انتظامی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے، افسوس کہ آہستہ آہستہ پھر وہ خوشدلی باقی نہ رہی اور مقبول صاحب علی گڑھ سے باہر اپنا مستقبل تلاش کرنے لگے جیسا کہ ان کی بیرونی خدمات کے ضمن میں آگے بیان ہوگا۔ صدارت شعبہ چھوڑتے چھوڑتے خود علیم صاحب کے ہاتھوں ان شعبوں کے حصے بخرے ہوئے اور وہ امتیازی صف بندیاں قائم ہوئیں جو کسی اجتماعی کام کے لئے بہر حال مفید تصور نہیں کی جاتیں۔

عربی اور اسلامیات کی مشترکہ لائبریری

شعبۂ عربی و اسلامیات کی مشترکہ لائبریری کو قدیم مآخذ اور جدید مطبوعات کے عظیم ذخیرہ سے مالا مال کرنے میں بھی مقبول صاحب کا بڑا حصہ تھا۔ بیان کرتے تھے کہ ادارہ علوم اسلامیہ کے قیام کے بعد سب سے پہلا کام اس کے لئے کتابوں کا فراہم کرنا تھا، کئی سو صفحات پر مشتمل مکتبۃ المثنیٰ بغداد کی ضخیم فہرست کے ساتھ دیگر فہارس کتب زیر غور رہتی تھیں، مختلف فہرستوں سے کتابیں چھانٹ چھانٹ کر علیم صاحب کی

اجازت سے کتابیں منگواتا تھا، ایک دن انہوں نے کہا کہ ایسے کب تک کتابیں منگواتے رہیں گے؟ پورا کا پورا کیٹلاگ آرڈر کر دیجئے۔ یہی وہ بار آور تخم تھا جس نے دھیرے دھیرے ترقی کر کے ملک میں اس لائبریری اور ادارہ کا نام روشن کر دیا اور چپہ چپہ سے علم و تحقیق کے جویا آکر سیراب ہونے لگے۔ چھٹی دہائی میں قدیم و جدید مطبوعات کی اتنی بڑی اور متنوع موضوعات پر مشتمل تعداد کی یکبارگی فراہمی اس وقت ایک ایسا امتیاز تھا جس کی مثال اس زمانہ کی سرکاری اور غیر سرکاری درسگاہوں میں ملنا شاذ و نادر تھی، اب بھی سرکاری تعلیم گاہوں کا حال قابلِ اطمینان نہیں ہے، اور اب خود عربیات و اسلامیات کی یہ مشترکہ لائبریری عصر جدید کے اشاعتی سیلاب کی روشنی میں پھر نئی غذا کے پہلے جیسے بڑے توشہ کی محتاج ہوتی جا رہی ہے۔

بہر حال شعبوں کی تقسیم کے بعد بھی علیم صاحب کی مرضی سے اگرچہ مقبول صاحب ہی متحدہ لائبریری کے انچارج تھے، لیکن دیگر شعبوں کی کتابیں منگانے میں ظاہر ہے کہ پھر ان کا کوئی عمل دخل نہیں رہ گیا تھا، بلکہ اقتدار کے نئے سوتوں کے درمیان بدگمانیاں پھیلا کر غرض مند لوگ انتشار پھیلانے اور انتظام میں رخنہ ڈالنے کا کھیل کھیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔

مسعودی کی ہزار سالہ برسی

ادارہ علوم اسلامیہ اور Indian Society for the History of Sceince, New Delhi کے تعاون سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۸-۱۹/ جنوری ۱۹۵۸ء کو مسعودی (وفات ۳۴۶ھ / ۹۵۷ء) کی ہزار سالہ برسی پر عالمی جشن شایان شان معیار پر منایا گیا، اس میں ہندوستان کے علاوہ یورپ، امریکہ، عرب و مسلم ممالک کے ساٹھ سے زیادہ فضلائے روزگار نے حصہ لیا، علمی پہلو سے اس جشن کی تیاری، پھر اس کے وسیع انتظامات کا اہتمام مقبول صاحب نے اپنے رفقاء کے تعاون سے

نہایت کامیابی سے انجام دیا، مسعودی سے متعلق ایک نمائش بھی ترتیب دی گئی، نیز عبدالرحمٰن صاحب کے اشتراک سے اس کی کارروائی اعلی معیار پر شائع کر کے مقبول صاحب نے اس جشن کو ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنادیا۔

اس سے پہلے ڈاکٹر مونس رضا صاحب کے زیر اہتمام انٹر نیشنل جغرافیہ سمینار منعقدہ ۹-۱۶/ جنوری ۱۹۵۶ء کے کلچرل پروگرام کا انتظام مقبول صاحب کے سپرد ہوا تھا جس میں اس پہلو سے وہ اپنی صلاحیتوں کا کامیاب مظاہرہ کر چکے تھے۔

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس

اسی مبارک جشن کے موقع پر وقت کے نامور ماہرین علوم اسلامیہ کی موجودگی میں آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا قیام عمل میں آیا، ۲۰/ جنوری ۱۹۵۸ء کو یونیورسٹی ہی میں برجستہ اس کا پہلا اجلاس منعقد ہو گیا، اس کا صدر دفتر علی گڑھ قرار پایا، ملک کے مختلف علمی اداروں میں اس کے دوسالہ اجلاس کی روایت بنی جو عرصۂ دراز تک قائم رہی، ہر اجلاس میں اس کے آئندہ کے عہدیدار منتخب ہوتے تھے، نویں اور آخری اجلاس منعقدہ جامعہ ہمدرد، نئی دہلی ۱۹۸۲ء کے علاوہ ہمیشہ مقبول صاحب اس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوتے رہے، اس مرتبہ اعزاز کے طور پر ان کو صدر بنایا گیا تو سکریٹری شپ تبدیل ہوئی، نئے عہدیداروں کو پرانے خزانچی سے حساب کتاب چکانے پر اصرار ہوا اور ان سے عدم تعاون کی شکایت پیدا ہوئی، آخر یہ مسئلہ انا اور ضد کا شکار ہو کر انتشار کا سبب بنا، تب سے اسلامیات کے خادموں کی یہ قدیم و مفید انجمن تعطل کا شکار ہے، اس کے بہی خواہ بس اس کے احیاء کے لیے زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں، عملی اقدام صفر ہے!

مقبول صاحب اپنی چوبیس سالہ (۵۸-۱۹۸۲ء) سکریٹری شپ کے دوران اس کے لیے فکر مند رہتے تھے، ابتدائی اجلاس ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۲ء علی گڑھ میں ہوئے، پھر چوتھا ۱۹۶۴ء عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں، پانچواں ۱۹۶۷ء جامعہ ملیہ

اسلامیہ نئی دہلی میں، چھٹا ۱۹۶۹ء دارالمصنفین اعظم گڑھ میں، صرف ایک بار کی ایک سالہ تاخیر کے علاوہ وقت پر ہوتے رہے، ساتواں اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہونا تھا، ذمہ داران ندوہ کے تردّد کی وجہ سے تاریخ طے نہ ہوپاتی تھی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں مقبول صاحب کی راقم سے ملاقات ہوتی تو بار بار سخت پریشانی کا اظہار کرتے اور دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں بعجلت اس کا انعقاد چاہتے، لیکن ندوہ کا معاملہ درمیان میں ہونے کی وجہ سے عم محترم مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی ازہری کو اشارہ و کنایہ میں بھی ان کا عندیہ نہیں پہنچایا جاسکتا تھا، آخرکار خود مقبول صاحب نے ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صاحب کے ذریعہ رابطہ قائم کیا اور اہل ندوہ نے پہلے بھوپال میں اس کے انعقاد کی تجویز پیش کی، تب ساتواں اجلاس ۱۹۷۴ء میں بھوپال میں ہوا، پھر آٹھواں ۱۹۷۸ء میں ندوہ اور آخری اجلاس جیسا کہ اوپر گذرا ۱۹۸۲ء میں دہلی میں ہوا تھا، جہاں اس کی قسمت پر ایسی مہر لگی جو آج تک توڑی نہ جاسکی!

سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کا قیام

سابق وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ (یکم مارچ ۱۹۶۵ء-۵/ جنوری ۱۹۶۸ء) کی کوششوں سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں Centre of West Asian Studies کے قیام کی تجویز University Grants Commission کے Area Study کے Programme کے تحت منظور ہوئی۔ اس اسکیم میں ایک پروفیسر + ڈائرکٹر، ایک ڈاکومنٹیشن افسر، دو دو سو روپیہ کی دو فیلوشپس کے علاوہ کتابوں کی طباعت، فیلڈ ورک اور لائبریری کے لئے کچھ روپیہ دیا گیا تھا۔ اس کا ابتدائی کام نئے تقرر تک اس وقت کے صدر شعبہ عربی و اسلامیات اور ڈائرکٹر ادارہ علوم اسلامیہ پروفیسر عبدالعلیم صاحب دیکھتے رہے۔

۱۶/ نومبر ۱۹۶۷ء کو مقبول صاحب نے اس کے پروفیسر اور ڈائرکٹر کی حیثیت

سے چارج لیا، ابتدا میں وہ تنہا تھے، کچھ عرصہ بعد ایک L.D.C محمد شفیع (۲) صاحب ملے اور مقبول صاحب کے خادم خاص عبدالملک خاں (۳) غالباً ایک زمانہ تک ملازمت کے بغیر دفتری کاموں میں مدد کرتے رہے، جلد ہی پروفیسر عبدالعلیم صاحب یونیورسٹی کے وائس چانسلر (جنوری ۱۹۶۸ء تا جنوری ۱۹۷۴ء) ہوگئے، مقبول صاحب کو ایک طرف عربی و اسلامیات کے بٹوارے کا قلق تھا تو دوسری طرف سنٹر کے کاموں اور تقرریوں میں خود مختارانہ آزادی کے فقدان کا غم! سنٹر کی تعمیر کے ابتدائی مراحل بڑے دشوار گذار تھے، اسے بنانا گویا جوئے شیر لانا تھا۔ سنٹر ایک مینجنگ کمیٹی کے ماتحت تھا جس کی صدارت وائس چانسلر کرتا تھا، اور ڈائرکٹر اس کا سکریٹری۔ اس کے اپنے فیلوز نہ تھے، اس لئے اس کی پہلی فیلڈ ورک گرانٹ کے استعمال کے لئے دیگر شعبوں کے مدرسین ڈاکٹر محمود الحق (اسلامیات)، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی (معاشیات) اور ڈاکٹر شاہ عبدالقیوم (سیاسیات) کو ۶۸-۱۹۶۹ء میں مصر، سعودی عرب وغیرہ ریسرچ کے لیے بھیجا گیا۔ سنٹر کے اپنے اسٹاف میں سب سے پہلے احمد اشفاق صاحب (۴) اپریل ۱۹۶۹ء میں Documentation Officer کی حیثیت سے مقرر ہوئے، پھر دسمبر ۱۹۷۱ء میں عارف حسین صاحب رضوی بحیثیت فیلو منسلک ہوئے۔

شعبۂ اسلامیات میں بیرونی نکتہ چینوں کے برخلاف مقبول صاحب کو اس نئے سنٹر پر یونیورسٹی کے بعض شعبوں کی حریصانہ نگاہوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں کی شکایت بھی رہتی تھی۔ اس لئے کہ ایک مستقل شعبہ کی حیثیت سے یونیورسٹی میں اس کا اپنا وجود مسلّم نہ تھا، وہ نہ ٹیچنگ ڈیپارٹمنٹ تھا نہ کسی فیکلٹی سے اس کا تعلق، اس لیے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے داخلے بھی نہیں ہوسکتے تھے۔ بالآخر پروفیسر نورالحسن صاحب (۵) کی وزارت تعلیم کے زمانہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کی رو سے وہ فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے تحت ایک مستقل بالذات شعبہ کی حیثیت سے تسلیم ہوا۔ مینیجنگ کمیٹی کے بجائے اس کی اپنی Board of Studies بنی اور اس کو دیگر شعبوں کی

طرح اپنے تدریسی و تحقیقی پروگرام طے کرنے کا حق حاصل ہوا۔

اسی دوران پروفیسر نورالحسن صاحب ہی کی حسنِ وساطت سے سنٹر کو تاریخ اور سیاسی علوم کی دو Readerships ملیں جن پر ۸/مارچ ۱۹۷۳ء کو بالترتیب ڈاکٹر مشیرالحق (۶) صاحب اور محمد عبدالسلیم خان صاحب منتخب ہوئے، ڈپلومہ آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کھلا، ایم فل اور پی ایچ ڈی میں داخلے شروع ہوئے تو سنٹر کی رونق بڑھی اور باقاعدگی سے تدریسی و تحقیقی کام کی رسم وراہ پڑی۔

پھر فروری ۱۹۷۶ء میں کچھ نئی آسامیاں آئیں: ان میں سے جدید عربی کی ریڈر شپ پروفیسر ڈاکٹر مسعودالرحمٰن خاں ندوی (۷) نے ۱۹/اپریل ۱۹۷۷ء سے، معاشیات کی لیکچرر شپ پر عارف حسین رضوی (۸) اور کھلی لیکچرر شپ پر ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی (۹) نے ۳۱/مارچ ۱۹۷۹ء سے کام شروع کیا۔ مصری فن تعمیر کی ماہر ایک تھائی خاتون ڈاکٹر مس کتیمہ امرودھت (۱۰) پوسٹ گریجویٹ فیلو کی حیثیت سے پہلے سے موجود تھیں اور مصر کی قدیم عمارتوں، اہرام وغیرہ پر کتاب تیار کر رہی تھیں۔ تین جونیر ریسرچ فیلوشپس سنٹر کے اوّلین طلباء کو ملیں۔ سنٹر کی لائبریری میں پروفیشنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے علیم اللہ صاحب (۱۱) اور مسرور علی صاحب قریشی (۱۲) ۱۶/نومبر ۱۹۷۶ء سے مقرر ہوئے۔ خصوصی کوششوں سے بعد میں پولٹیکل ڈیولپمنٹ کی پروفیسرشپ بھی آئی لیکن مقبول صاحب کے ریٹائرمنٹ ۳/مئی ۱۹۷۹ء تک بھری نہ جاسکی، کافی عرصہ کے بعد اس نئی پوسٹ پر محمد عبدالسلیم خان (۱۳) صاحب اور خود مقبول صاحب کی خالی کی ہوئی عام پوسٹ پر ڈاکٹر محمود الحق (۱۴) صاحب کا تقرر ۵/اپریل ۱۹۸۲ء کو ہوا۔ ان نئی تقرریوں سے ظاہر ہے کہ سنٹر ہرا بھرا ہو گیا اور اس میں مختلف النوع کاموں کا اضافہ ہوا۔

مقبول صاحب کی صدارت کے آخری زمانے میں ۳۰/ستمبر ۱۹۷۸ء کو بورڈ آف اسٹڈیز سے ایک اور مفصل تجویز پاس ہوئی تھی، اس میں سنٹر کی توسیع کے امکانات

کو سامنے رکھ کر مزید آسامیاں مانگی گئی تھیں، مقبول صاحب ریٹائر ہوگئے، معائنہ کے لئے UGC Review Committee کے آنے میں دیر ہوتی گئی، اس دوران چھٹے پنجسالہ منصوبہ (۸۰-۱۹۸۵ء) کے لئے مذکورہ تجویز کی روشنی میں نئی تجویز بھی پیش ہوئی جس کے تحت ۲۴ر مئی ۱۹۸۳ء کو مذکورہ بالا تجاویز کی متعدد سفارشات منظور ہوئیں، جس سے سنٹر کی سرگرمیوں میں معتد بہ اضافہ ہوااور آبادی بڑھی۔(۱۵)

ویسٹ ایشیا کی سمینار لائبریری

بیسویں صدی کے نصف آخر میں تیسری دنیا سے سامراج کے خواہی نخواہی کوچ کرنے کے بعد "نیا جال لائے پرانے شکاری" کے بمصداق ان اقوام کو دام تزویر میں پھنسانے کے لئے بین الاقوامی تعلقات اور عالمی تعاون کا غلغلہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے بلند ہوااور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قدیم دوستانہ تعلقات اور مشترک مفادات کی دہائی ہر چہار سو سنائی دینے لگی، اب یہ ہماری ہوشمندی پر منحصر ہے کہ اس واقعی مفید موضوع کے خطرناک پہلو کا شکار ہونے کے بجائے اس کو اپنے ملکی و قومی مفاد میں بیش از بیش استعمال کریں۔ بہر حال اس نئی ضرورت کی تکمیل کے لئے قدیم مواد ہی کی مدد سے نئی نئی مطبوعات اور قسم قسم کے مخصوص رسائل و جرائد کا سیلاب امنڈ پڑا، روز بروز بڑھتی ہوئی عالمی مہنگائی کے سامنے بڑے وسائل کی مالک مستحکم لائبریریاں تک تنگ دستی کا شکوہ کرنے لگیں۔ اس پسِ منظر میں ویسٹ ایشیا کی قابلِ ذکر لائبریری کا قیام ایک چیلنج تھا، مقبول صاحب نے محدود وسائل کے بہترین استعمال سے اس کی مستحکم بنیاد رکھی، ان کے جانشینوں نے اس کو پروان چڑھایا، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دہلی جیسے لامحدود وسائل کے شہر سے آنے والے اسکالرز کسی کام سے علی گڑھ پہنچتے تو اس لائبریری کی نئی مطبوعات سے فائدہ کے لئے اپنا قیام بڑھادیتے تھے، لیکن UGC کی طرف سے

خصوصی مالیاتی معاونت پر اچانک قدغن نے سارے خواب بکھیر دیئے۔ مزید پریشانی یہ ہے کہ مستقبل قریب میں اس اندھیرے کے چھٹنے کی امید نہیں!

سمینار سنیٹر آف ویسٹ ایشیا

مقبول صاحب کے دور صدارت کے کل ہند پیمانہ پر سمیناروں میں ایک سمینار Socio-Economic and Political Problems of West Asia ۱۹۷۰ء میں and North Africa کے عنوان سے ہوا تھا، لیکن نہ اس کی کارروائی شائع ہوئی، نہ عرصہ سے اس کا ریکارڈ دیکھا۔ دوسرا یادگار سمینار Contemporary West Asian Scene پر تھا جو ۲۸-۲۹/ جنوری ۱۹۷۸ء کو منعقد ہوا تھا، اس میں ملک کے چونسٹھ نمائندہ شرکاء نے حصہ لیا تھا، اس کے منتخبہ مقالات کا مجموعہ بترتیب عارف حسین رضوی ۱۹۸۰ء میں سنٹر ہی سے بعنوان بالا شائع ہو چکا ہے۔

ویسٹ ایشیا کی نئی عمارت

سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کس مپرسی کی حالت میں قائم ہوا تھا، ظہور وارڈ پہلے سے مستحکم عربی و اسلامیات کے شعبوں اور ادارہ علوم اسلامیہ کے عملہ ہی کے لئے ناکافی تھا، نئے مہمان کو کافی قربانی کے جذبہ کے ساتھ پہلے مشترک لائبریری کے چھوٹے سے ایک جانبی کمرہ میں، اس کے بعد قدیم لائبریری کے ترمیم شدہ بعض حصوں میں جگہ ملی۔ تقریباً پندرہ سال تک انہی دو تین کمروں کو حسب ضرورت اور چھوٹا کر کے یا موجودہ Reading Room میں عارضی Cubicles بنا کر بڑھتے ہوئے اسٹاف کی ضرورتوں کو پورا کیا گیا۔ مقبول صاحب اپنے رسوخ سے کام لیتے رہے لیکن کامیابی کی شکل اس وقت نکلی جبکہ وہ تین سال کے لئے ۱۹۷۶ء میں University Grants Commission کے رکن بنے، شاید عمارت کی منظوری ۱۹۷۷ء میں آگئی تھی لیکن یونیورسٹی کے کاموں کی رفتار کے

معمول کے مطابق، مئی ۱۹۷۹ء میں ان کے ریٹائرمنٹ تک سنگ بنیاد کی بھی نوبت نہ آئی، خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کے بعد صدر شعبہ محمد عبدالسلیم خان صاحب (۷۹-۱۹۸۴ء) نے احسان شناسی کا حق ادا کرتے ہوئے یکم ستمبر ۱۹۷۹ء کو مقبول صاحب ہی کے دستِ فیض سے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا، نئی عمارت کے Porch میں عربی اور انگریزی میں لکھا ہوا ایک خوبصورت کتبہ ان کی دل آویز یاد دلاتا رہے گا۔

اعزازی پروفیسر ویسٹ ایشیا

پھر پروفیسر محمود الحق صاحب کے اول دور صدارت (۸۴-۱۹۸۷ء) میں مقبول صاحب کی نمایاں علمی و تحقیقی خدمات اور سنٹر کے قیام واستحکام اور ترقی کے لئے مسلسل مساعی جمیلہ کے اعتراف کا خیال آیا، اس نیک خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سنٹر کی بورڈ آف اسٹڈیز نے ۵/ جنوری ۱۹۸۶ء کو ایک تجویز منظور کی، جس کی رو سے یونیورسٹی میں ان کو Professor of Emeritus West Asian Studies بنانے کی تحریک شروع ہوئی۔ کونسل سیکشن رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مراسلہ نمبر C-I-AC(5-699) مورخہ ۴/ نومبر ۱۹۸۶ء کے مطابق یہ تجویز ۲۱/ جنوری ۱۹۸۶ء کو فیکلٹی آف سوشل سائنسز سے پاس ہوکر ۵/ اپریل ۱۹۸۶ء کو اکیڈمک کونسل سے منظور ہوئی اور سنٹر سے ان کی تاحیات وابستگی کا اعزاز ان کے قدردان متوسلین کو حاصل ہوا! اسی مراسلہ میں مذکور ہے کہ فیکلٹی میں ۱۴/ مئی ۱۹۸۶ء اور کونسل میں ۹/ اگست ۱۹۸۶ء کو مذکورہ تجویز کی دوبارہ توثیق ہوئی۔

ایڈیٹر مسلم یونیورسٹی گزٹ

مقبول صاحب مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ کے ایڈیٹر اور نگراں اعلی بھی رہے تھے، قدیم شماروں میں اس حیثیت سے ان کا نام فروری ۱۹۶۲ء تا اگست ۱۹۶۵ء ملتا

ہے،اس لحاظ سے وہ اس سے ساڑھے تین سال وابستہ رہے۔

ڈائرکٹر / ممبر انچارج مسلم یونیورسٹی پبلکیشنز ڈویزن

موجودہ ذمہ دار شعبۂ مطبوعات مسلم یونیورسٹی عبدالاحد خان صاحب نے دفتری فائلوں کی مدد سے بتایا کہ پروفیسر منیب الرحمٰن صاحب(۱۶) (شعبہ اسلامیات) کے بعد مقبول صاحب اس شعبہ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے تھے، ۲۵/اگست ۱۹۷۰ء سے دفتری کاغذات میں اس حیثیت سے ان کے دستخط ملنے لگتے ہیں، پھر ۱۹۷۳ء میں ڈائرکٹر کے بجائے یہ عہدہ "ممبر انچارج" کے نئے نام سے بدلا تو اس نئی حیثیت میں بھی وہ ۱۰/اگست ۱۹۷۷ء تک یعنی سات سال اس شعبہ سے وابستہ رہے۔

ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

قدامت کی بنیاد پر ۱۹۷۷ء میں مقبول صاحب کے Faculty of Social Sciences کے ڈین بننے کی باری بھی آئی تھی، لیکن رجسٹرار کے فون سے معلوم ہوا کہ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی (۱۷) جو اپنی باری کے وقت سوریا (شام) میں ہندوستان کے سفیر تھے اب اپنا حق استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ مقبول صاحب نے ان کی خواہش کے احترام میں اپنی باری چھوڑدی، حالانکہ وقتی طور پر ان کو قلق ہوا اور موقعہ دیکھ کر بعض ہمنشینوں نے مقدمہ تک کے لیے ورغلایا، لیکن شکر ہے کہ دوسروں سے نہ الجھنے کی عادت اور فتنہ وہنگامہ سے گریزاں طبیعت غالب آئی اور کسی بدنمائی کے بغیر بات آئی گئی ہوگئی۔

سنٹر و یونیورسٹی اور ان کے وابستگان سے مخلصانہ محبت

سنٹر سے مقبول صاحب کی محبت بلکہ عشق تو فطری تھا کہ یہ بار آور پودا انہی کا لگایا ہوا تھا، اس کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے فکر مند رہنا، اس کے اساتذہ و طلبا اور دیگر عملہ

کی فرداً فرداً خبر لیتے رہنا تو گویا معمول تھا، پھر ان کے ساتھ ہمدردی کا مساویانہ انسانی سلوک بھی ایک امتیازی وصف تھا۔ ایک واقعہ یاد آتا ہے: ۱۹۷۸ء میں ایک سمینار سنٹر میں منعقد ہونا طے ہوا جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، تیاریاں زور و شور پر تھیں، ایک جشن کا سماں تھا، مختلف اغراض سے طرح طرح کے لوگوں کا ہجوم تھا، ایک صاحب(۱۸) نے اس موقعہ پر سنٹر کا تعارفی کتابچہ (Brochure) شائع کرنے کی تجویز رکھی، مقبول صاحب نے خوشدلی سے اس کا استقبال کیا اور جلد ہی لکھ کر تیار کر دیا، پھر وہ آرٹ پیپر پر دیدہ زیب کور کے ساتھ چھپا اور شرکائے سمینار میں تقسیم ہوا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سنٹر کے فیکلٹی ممبران کی فہرست میں دفتری عملہ اور ماتحت خادم ملازمین کے نام بھی اہتمام سے شائع ہوئے تھے، اکثر شرکائے سمینار کے لئے یہ چیز نئی تھی، انہوں نے اس کی قدر کی اور مقبول صاحب کی انسانی اقدار کی عملی رعایت کا چرچا کیا۔ اسی طرح ان کی آخری کتاب A History of. Arab-Islamic Geography. ۱۹۹۵ء میں اردن سے شائع ہوئی تو لاتعداد ملکی و غیر ملکی نامور اہل علم، قدیم احباب، سنٹر اور یونیورسٹی کے رفقائے کار، اہل خاندان وغیرہ کے ساتھ خدمتگار ملازمین کا بھی نام بنام شکریہ ادا کیا اور مجھے لکھا کہ یہ شکریہ ان کو دکھایا جائے۔ آخری سانس تک سنٹر اور یونیورسٹی کے وابستگان کے ساتھ اس معمول میں فرق نہ آیا، ساجد(۲۰) بستر مرگ پر ان کے سرہانے موجود تھے، ان کا بھی یہی بیان ہے۔ لیکن علیگ نہ ہوتے ہوئے بھی علی گڑھ کلچر کو اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرنا اور ان میں رچ بس جانا حیرت انگیز تھا، خاص طور پر ایسے شخص کے لئے جو علی گڑھ کا پروردہ نہ ہو۔ انگلینڈ میں ان کے محبوب اہل و عیال تھے، علم و تحقیق کے اسباب و وسائل کی فراوانی تھی، قابل رشک حد تک نظم و ضبط کی پابند صاف ستھری خوشحال بے فکر زندگی تھی، گویا زمین پر جنت کے مزے تھے، اس ماحول میں ان جیسی تعلیم و تربیت اور ذہن و فکر کا کوئی شخص علی گڑھ کے کثافت و غلاظت سے بھرے ہوئے محلّوں، بدبودار کھلی نالیوں، ناہموار اور غبار آلود سڑکوں، ہر انہونی کے لئے بدنام یونیورسٹی اور نفسا نفسی کی دوزخ میں مبتلا اس

کے وابستگان کو ہر دم یاد کرتا رہے اور ہر مجلس میں کھینچ تان کر اس کا تذکرہ کرتا رہے تو کیا تعجب نہ ہوگا؟ کبھی جسارت کر کے ٹوکا کہ اس قابلِ رشک علی گڑھ میں عداوت و حسد اور کاٹ چھانٹ کے جو مناظر دیکھنے میں آتے ہیں، ان کے بعد علی گڑھ سے باہر مزے لے لے کر اسی کے برے بھلے کی رٹ لگائے رہنا سمجھ سے بالا ہے! تو ٹھٹھک کر مسکرا دیتے اور پھر وہی ڈھاک کے تین پات، گویا یہ مضمون تھا ؎

من تو شدم، تو من شدی، من تن شدم، تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی ملمع کاری گو سحر انگیز تھی پر عارضی و ناپائیدار تھی، اور مشرقی تہذیب کی چھاؤں گو اتنی گھنی نہ رہی تھی پر گھٹی میں رچی بسی تھی، جوان کو زیادہ دن علی گڑھ سے دور نہیں رہنے دیتی تھی، اور بار بار واپس آکر اس کی آب و ہوا میں تازگی محسوس کرتے تھے، اگر ان کو انگلینڈ کے ماحول میں Unfit کہا جاتا تو ہنس کر ٹال دیتے۔

طفلانہ آرزوئیں رکھتے تھے اور جب اظہار کرتے تو معصوم دل کے پرت تازہ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کھل جاتے! ۵۳یا۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی کے مشہور و مقبولِ عام و خاص پُر کیف ترانہ کی ہیجان خیز اور ولولہ انگیز مستانہ دھن اشتیاق محمد خاں صاحب (وفات ۱۹۹۷ء) نے اتفاق سے مقبول صاحب کے ذاتی ہارمونیم پر بنائی تھی۔ مقبول صاحب کے الفاظ میں:

"اس میں بڑی جان اور بھاؤ تھا... آہستہ آہستہ وہ اسے بہتر بناتے رہے، اب یہ بے انتہا متاثر کرنے والا جذبات سے پر ترانہ بن گیا ہے۔"

اس حسین یاد کو دل سے عزیز رکھتے فخریہ تذکرہ کرتے اور اس یادگار ہارمونیم کو اس کے شایان شان تقریب میں یونیورسٹی کو نذر کرنے کی آرزو برسوں سے سجائے بیٹھے تھے۔ اگرچہ بقول ان کے:

"میری طرح اب اس کی جسمانی حالت بھی خستہ ہے مگر سُراب بھی
سریلے ہیں اور روح کو تازگی بخشتے ہیں! آئندہ کبھی اس کو یونیورسٹی کے سپرد
کردوں گا تاکہ ایک اہم یادگار باقی رہے۔"

مگر ہم جیسے بزدل متوسّلین کو اندیشہ کہ کہیں اربابِ جامعہ نے اس والہانہ جذبہ کی کماحقہ قدر نہ کی اور خاطر احباب کا خیال نہ رکھا تو ان کے معصوم آبگینۂ دل کو ٹھیس نہ لگ جائے، جب کہ وہ عاشقِ زار، شرمسارِ نگاہِ نرگس و پابستۂ گیسوئے سنبل اپنے دمِ واپسیں پر بھی ساجد کو وصیت کر گیا کہ ہارمونیم یونیورسٹی کو اور باقیماندہ کتابیں سنٹر کی لائبریری کو ہدیہ کردی جائیں! مگر اب وہ مولوی مدن والی بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے، جوان کی حیات میں ہوتی؟!

ایکٹنگ

اس مناسبت سے یہ بات بھی یاد آئی کہ اشتیاق محمد خان صاحب ہی نے دور درشن کے لئے مسلم یونیورسٹی پر ایک Documentary Film بھی بنائی تھی، اس میں مقبول صاحب سے خواجہ الطاف حسین حالی کا کردار ادا کرنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے بہت ذوق و شوق سے اس کردار کو کامیابی سے ادا کیا تھا۔ ۱۹۹۲ء میں مقبول صاحب اس فلم کا ویڈیو کیسٹ اپنے ساتھ لندن لے گئے تو اہل و عیال نے نہ صرف اس سے لطف لیا بلکہ زہرہ نے ساؤتھ ہال کے ایک ریستوران میں اس کی نمائش کی جس کے ذریعہ علی گڑھ کے پرستاروں کو لندن میں مسلم یونیورسٹی کی تاریخ چلتی پھرتی، متحرک اور رواں دواں دیکھنے کا موقع ملا اور حاضرین شکر گزار ہوئے۔

فصل دوم

بیرونی خدمات

چند صفحات پہلے مقبول صاحب کی علی گڑھ سے والہانہ محبت و تعلق کا ذکر ہو چکا ہے، لیکن ان کی بات چیت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یونیورسٹی میں از ابتدا تمام حالات ان کی مرضی کے مطابق نہیں تھے، پھر اس کی تصدیق انکی غیر مطبوعہ "آپ بیتی" سے بھی ہوئی۔

۱۹۵۱ء میں سینئر لیکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہوئے اور جلد ہی ۱۹۵۴ء میں ریڈر کے عہدہ پر ترقی مل گئی تو اس زمانہ کے لحاظ سے بظاہر یہ ان کے لئے خوش آئند بات تھی، نیز یونیورسٹی میں ان کے ہم خیال ترقی پسندوں کا بول بالا بھی عین ان کے اطمینان کا باعث تھا، لیکن اس حسبِ مزاج ماحول کے باوجود ان کے تکدر اور دلآزاری کے لئے یہی کافی تھا کہ اس زمانہ میں دبی زبان سے ترقی پسندوں کے خلاف چہ میگوئیاں ہوتی تھیں جن کو اکثر وہ اپنی ذات کے خلاف سمجھتے اور دل پر لیتے تھے، رہی سہی کسر اس حلقہ سے مربوط خود غرض قسم کے حاشیہ بردار پوری کر دیتے تھے، جن کا بنیادی کام مرضی کے خلاف چھوٹی موٹی باتوں میں طویل المیعاد فرضی خطرات و احتمالات کی آمیزش سے زخموں کو کریدنا، رفقائے کار کے درمیان خلیج کو کشادہ کرنا اور حاصل شدہ دراڑ میں طفیلیہ کی طرح اپنی جگہ بنانا تھا، ان حاشیہ نشینوں نے بعد میں یہی کام خود مقبول صاحب کے حلقہ یاران کے اختلاف میں انجام دیا اور ان کی خوشدلی کو ہمیشہ کی بددلی سے بدل دیا۔ اجتماعی کاموں میں متعلقہ افراد کے درمیان مزاج و ماحول اور آراء و افکار کا اختلاف قانون فطرت ہے، اور اس زمانہ میں تعلیمی اداروں میں ترقی کے مواقع بھی نایاب تھے اور حق تلفی و زیادتی کے احساس سے کبھی کوئی زمانہ خالی نہیں رہا لیکن مقبول صاحب کے

دل میں طرح طرح کے خدشات کا ہوا اس طرح بٹھادیا گیا تھا کہ آخر وقت تک ان ناگواریادوں کے چنگل سے وہ اپنے کو آزاد نہ کرسکے اور اپنی "آپ بیتی" میں تلخی کے ساتھ ان باتوں کا بار بار تذکرہ کیا، ان کی تحریروں سے پہلے اول نوع کی نکتہ چینیوں اور اس کے بعد قسم دوم کی شکایتوں کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

"۱۵/اگست ۱۹۵۱ء میں میرا تقرر علی گڑھ یونیورسٹی میں بحیثیت سینئر لیکچرر عربی اور اسلامک اسٹڈیز ہوا اور میں نے علیم صاحب کے ساتھ کام شروع کردیا۔ شعبہ میں شمولیت کے بعد عربی ڈیپارٹمنٹ کا نام بڑھا کر عربی اور اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ رکھدیا گیا، لیکن بعض حلقوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ یہ ترقی پسند لوگ اسلامک اسٹڈیز پڑھانے کے مستحق نہیں، اردو اخباروں میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا، لیکن ان حضرات کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اسلامک اسٹڈیز کیا ہے؟ دراصل یہ مضمون تاریخ سے متعلق تھا، اس کا نصاب بنانے میں پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر نورالحسن، پروفیسر عبدالعلیم اور میں شامل تھے، اس کا دینیات سے کوئی تعلق نہیں تھا، اسلامی تہذیب و تمدن تاریخی نقطۂ نظر سے پڑھانا مقصود تھا۔ دراصل نکتہ چیں حضرات کا مقصد تو علیم صاحب اور مجھ پر اعتراض کرنا تھا نہ کہ اس مضمون پر.... رفتہ رفتہ اسلامک اسٹڈیز کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں اور یہ ایک مستقل مضمون بن گیا۔"

یونیورسٹی سے وابستگی کے وقت یہاں کے مجموعی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے مقبول صاحب نے اس کی اچھائیوں اور برائیوں پر اظہار خیال کیا ہے اور تقسیم کے بعد مسلمانوں کے خلاف معاندانہ فضا میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی بحیثیت وائس چانسلر (۳۰/نومبر ۱۹۴۸-۱۵/ستمبر ۱۹۵۶ء) علی گڑھ آمد کو فالِ نیک قرار دیتے ہوئے لکھا:

"میری نظر میں انہوں نے دو اہم کام اپنے زمانہ میں انجام دیئے: ایک

تو یہ کہ نیشنلسٹ اور ترقی پسند اساتذہ کو انہوں نے علی گڑھ میں جگہ دینا شروع کی، حالانکہ اس دور میں ترقی پسند مسلمان حکومتِ وقت سے نالاں تھے اور خاص طور سے کانگریس سے بیزار، لیکن ڈاکٹر صاحب نے باوجود اس کے کہ وہ خود حکومت کے چنندہ آدمی تھے اس کی مطلق پروانہ کی، انہیں غالباً یہ احساس تھا کہ یہ لوگ بہر حال مسلم لیگی خیالات کے حامی اساتذہ سے بہتر ہیں اور ملک میں مسلمانوں کے خلاف تعصب کی جو لہر دوڑی ہوئی تھی اس کا بھی یہی لوگ مقابلہ اور سدِّ باب کر سکتے ہیں۔ اس پالیسی کے ماتحت آہستہ آہستہ کئی اساتذہ علی گڑھ پہنچ گئے اور مختلف شعبوں میں ان کا تقرر ہونے لگا...

غرضکہ دس پندرہ سال تک علی گڑھ میں ترقی پسندی کا بول بالا رہا، یہ لوگ نہ صرف علی گڑھ کی سیاست پر حاوی تھے، تعصّب اور رجعت پسندی کا مقابلہ کر رہے تھے، بلکہ یونیورسٹی کے انتظامی امور میں بھی ان کا کافی دخل تھا، انہیں ذاکر صاحب کی سرپرستی اور معاونت تمامتر حاصل تھی، ان کی مدد سے ذاکر صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ڈوبنے سے بچایا اور ایک نئی زندگی بخشی۔"

علی گڑھ کی برائیوں کے مختصر تذکرہ میں تحریر کیا ہے:

"علی گڑھ کی جو بات مجھے بری لگتی تھی وہ یہ تھی کہ عام طور سے اساتذہ یونیورسٹی کی لوکل سیاست میں اپنا وقت زیادہ صرف کرتے تھے اور پڑھنے لکھنے میں کم۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ علمی ماحول بالکل نہیں تھا، یقیناً تھا، لیکن گنے چنے لوگ ہی تھے جو اپنے مضمون میں دلچسپی رکھتے تھے اور اس میں اضافہ کر رہے تھے... علی گڑھ میں ترقی پسندوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ان کی علمی و سیاسی سرگرمیاں بعض حلقوں میں پسند نہیں کی جاتی تھیں، لیکن ذاکر صاحب کی بھاری بھرکم شخصیت کی وجہ سے یہ حلقے خاموش رہتے۔ ان کے جانے کے بعد ان حلقوں نے اپنی طاقت متحد کی اور (کرنل بشیر حسین) زیدی صاحب کی

مخالفت شروع کردی، آخر کار ترقی پسندوں کے خلاف ایک محاذ قائم ہو گیا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب نئے نئے ڈیپارٹمنٹ وجود میں آرہے تھے اور ان حضرات کا مطمح نظر ان پر جا و بیجا طریقہ سے قبضہ کرنا تھا، ان میں خصوصی طور پر شعبۂ تاریخ اور انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز تھا جو ۱۹۵۴ء میں قائم ہو چکا تھا۔"(۲۰)

وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی (۷/اکتوبر ۱۹۵۶ء- ۶/نومبر ۱۹۶۲ء) کے ذکر میں ایک اور جگہ مختصراً لکھا ہے:

"کرنل زیدی کو بھی انہیں حضرات کی ریشہ دوانیوں کا سامنا کرنا پڑا جن کا ادارہ علوم اسلامیہ کو سامنا کرنا پڑا تھا۔"

ان کے بعد بدرالدین طیب جی وائس چانسلر (۷/نومبر ۱۹۶۲ء-۲۸/فروری ۱۹۶۵ء) کے زمانہ کے حالات کا "آپ بیتی" میں کوئی ذکر نہیں ہے، صرف ان سے اپنے ذاتی تعارف کا ذکر کر کے لکھا ہے:

"ان کے بعد مسٹر بدرالدین طیب جی آئے لیکن ان کا اندازِ عمل جداگانہ تھا، مسٹر طیب جی بذاتِ خود بہت نفیس شخص ہیں اور ساتھ ہی صاف گو بھی۔"

وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ (یکم مارچ ۱۹۶۵ء- ۵/جنوری ۱۹۶۸ء) کے ساتھ افسوسناک حادثہ کے بیان میں الزام کی انگلی مخالف گروہ کی طرف نمایاں طور پر اشارہ کر رہی ہے:

"۱۹۶۵ء میں نواب علی یاور جنگ علی گڑھ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے، مگر یونیورسٹی کے ایک گروپ نے ان کے خلاف چہ میگوئیاں شروع کر دیں اور طرح طرح کے جھوٹے الزامات عائد کرنا شروع کر دیے۔

میری کئی ملاقاتیں نواب صاحب سے ہوئی تھیں اور میں جانتا تھا کہ وہ ایک وسیع الخیال اور ترقی پسند انسان تھے، مگر جو الزامات ان پر عائد کئے جا رہے

تھے ان میں کوئی سچائی نہ تھی، دراصل ان کے مخالفین ان کی جگہ کسی اور کو وائس چانسلر مقرر کرنا چاہتے تھے۔ اس غلط پروپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کورٹ کی میٹنگ ہو رہی تھی، ان کے خلاف یونیورسٹی اور اسکولوں کے طلبا کو بھڑکایا گیا اور ایک جلوس کی شکل میں ان لوگوں نے کورٹ کے ممبران پر حملہ کردیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ وائس چانسلر مسلم طلبا کو پچھتر فیصدی سیٹیں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، حالانکہ علی یاور جنگ نے یہ مطالبہ قبول کر لیا تھا، صرف اس کا انتظار تھا کہ کورٹ اسے منظور کرلے، اس کے بعد وہ اس کا اعلان کردیں گے۔ اس ہنگامہ میں کئی سینئر اساتذہ کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا اور کئی پر جارحانہ حملے بھی ہوئے۔ علی یاور جنگ پر تو اتنی ضربیں لگائی گئیں کہ وہ بری طرح زخمی ہوئے، انہیں یونین بلڈنگ سے کھینچ کر ایس ایس ہال لے جایا گیا اور وہاں چند لوگوں نے ان کو ایک کمرہ میں بند کردیا، ان کا یہ حال تھا کہ اگر ایک وار اور ہو جاتا تو ختم ہو جاتے! میں نے اپنی علی گڑھ کی زندگی میں ایسا قبیح منظر کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی ایسے بیدردانہ حملے! میں سمجھتا ہوں کہ نواب علی یاور جنگ کا حادثہ علی گڑھ کی زندگی میں ایک واٹرمارک تھا! اس کے بعد سے علی گڑھ کا سیاسی ماحول اور خراب ہو گیا اور یونیورسٹی منزل کی طرف مائل ہو گئی، رجعت پسندانہ گروہ حاوی ہوتے گئے یونیورسٹی کا تعلیمی معیار گرتا گیا اور آج بھی صورت حال کوئی بہتر نہیں۔"

علی گڑھ میں انتشار ذہنی کی وجہ مخالف گروہ سے سیاسی یا ذاتی چشمک تو مقبول صاحب کی ابتدائے ملازمت سے واضح تھی اور بیزاری کے ساتھ اس کا زبانی چرچا ہمنشینوں کے سامنے بھی ہوتا رہتا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر بعض غرضمند لوگ خطرہائے دور دراز کا ہوا بٹھا کر خوف کی نفسیات پیدا کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ خود ترقی پسند حلقہ میں حکایتوں اور شکایتوں سے بڑھ کر بات رقابتوں تک

پہنچ چکی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ ہر شعبہ میں One man show کی پالیسی کے تحت کسی ایک بزرگ کے ذاتی مفادات کی بالاتری تھی، اس ماحول میں دیگر کارکنوں کو ان کی ذاتی امنگوں کے مطابق تگ و تاز کے مواقع نہ ملنا قدرتی تھا، جس سے خود اس گروہ کے افراد میں بے اطمینانی پھیل چکی تھی، مقبول صاحب بھی ان شکستہ دل لوگوں میں سے ایک تھے، اس لیے ان کی ''آپ بیتی'' میں از ابتدا کہیں مندی لے میں اور کہیں برملا اس بددلی کا اظہار ملنے لگتا ہے۔ سب سے پہلے اس پراگندہ ماحول کی طرف واضح اشارہ اپنے والد صاحب کے تعارف میں کیا ہے، جہاں ان کے اور دیگر صوفیاء اور اولیاء کے جذبہ خدمت خلق کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''شاید اسی جذبہ کے تحت میں انگلستان میں برٹش کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنا... کہ یہ ایک صداقت پسند پارٹی ہے اور عوام کی فلاح و بہبود چاہتی ہے، لیکن ہندوستان آنے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ اس کے کارکنوں میں خود پرستی، غرور و تکبر، منصب کی تمنا اور پارٹی کے مقاصد کو اپنے ذاتی مقاصد پر قربان کرنا عام ہے تو چند سال بعد میں اس پارٹی سے الگ ہو گیا تھا۔''

اس کے بعد ایک بالواسطہ اشارہ معین احسن صاحب جذبی کے تعارف میں آیا ہے جو ادارہ علوم اسلامیہ کے ''خردمندوں'' سے ملنے کبھی کبھی اس ادارہ میں آجایا کرتے تھے، لکھا ہے:

> ''جذبی صاحب سے کون واقف نہیں؟ ہندوستان کے چند اہم ترقی پسند شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے، لیکن جس زمانہ میں ان سے میری ملاقات ہوئی اور برسوں ہوتی رہی، انہوں نے شعر کہنا یا تو بند کر دیا تھا یا کم کہنے لگے تھے، وہ ترقی پسندوں کی سیاست سے تنگ آچکے تھے۔''

پھر ۱۹۵۵ء تک اپنے خانگی حالات کے بیان کے بعد درس و تحقیق میں اپنی محویت کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا:

"میں علی گڑھ کے چند ابتدائی سالوں میں سیاست میں شریک رہا، مگر آہستہ آہستہ یہ احساس پیدا ہوتا گیا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ سیاسی حضرات کی خودغرضی اور عالمی سیاست کی تبدیلیوں کو دیکھ کر میں نے طے کرلیا تھا کہ سیاست میں وقت ضائع کرنے کے بجائے تحقیق و تدریس میں زیادہ وقت صرف کرنا چاہئے، ورنہ آخری مراحل میں یہ احساس ہوگا کہ ہم نے نہ علم کی خدمت کی اور نہ یونیورسٹی کا فرض منصبی ہی پوری طرح ادا کیا... اسی زمانہ میں ایک مرتبہ کرنل زیدی نے مجھ سے نجی طور پر کہا کہ آپ وی ایم ہال کے پرووسٹ ہوجائیں... میں وقتی طور پر راضی ہوگیا، کرنل زیدی نے تاکید کی کہ اس تجویز کو صیغۂ راز میں رکھئے گا کیوں کہ وہ دہلی جانے والے تھے، لیکن کسی طرح مجھ سے یہ بات چھپائی نہ گئی اور بات پھیل گئی، جب کرنل زیدی واپس آئے تو سینئر لوگ ان سے ملے اور میری مخالفت کی، کرنل زیدی نے بلاکر معذرت کی کہ ان حالات میں وہ مجھے پرووسٹ نہیں مقرر کرسکتے، میں نے خدا کا شکر ادا کیا!"

بہر حال ان ناموافق حالات کا قدرتی اثر ہونا شروع ہوا اور مقبول صاحب نے یونیورسٹی سے باہر اپنے مستقبل کی تلاش شروع کی۔ "آپ بیتی" میں پہلی بار اس کا اظہار اپنی بیگم کے ۱۹۵۸ء میں Indian School of International Studies نئی دہلی میں تقرری کے ذیل میں اشارتاً کیا ہے:

"ڈاکٹر لپادورائے مجھے بھی اس اسکول میں ویسٹ ایشیا ڈیپارٹمنٹ میں لینا چاہتے تھے مگر بعض وجوہ کی بنا پر وہ ایسا نہ کرسکے۔"

اس کے بعد جب ۱۹۶۶ء میں استاد زائر کی حیثیت سے مقبول صاحب کو Indian Institute of Advanced Study شملہ جانے کا موقع ملا تو یونیورسٹی اور پروفیسر عبدالعلیم صاحب سے اپنی شکایتوں کا کھل کر تفصیل سے ان الفاظ میں ذکر کیا:

"میں ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ سے دو سال کی چھٹی لے کر (شملہ) پہنچ گیا، میرے لئے بھی اچھا ہی ہوا اس لئے کہ میں علی گڑھ کی سیاست سے تنگ آچکا تھا اور میری ترقی کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ میں علی گڑھ میں اپنے کام میں حسبِ معمول مشغول تھا مگر اس بات سے ناامید ہو گیا تھا کہ یونیورسٹی میرا کوئی ریسرچ پروجکٹ منظور ہونے دے گی۔

آکسفورڈ کے قیام کے زمانہ میں میں نے المسعودی کی مروج الذھب و معادن الجوھر کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، وہ ادھورا تھا، میں چاہتا تھا کہ یہ مکمل ہو کر شائع ہو جائے، گب صاحب کی بھی دیرینہ خواہش تھی کہ مروج الذھب کا مکمل ترجمہ شائع کر دوں، چنانچہ اس سلسلہ میں میں نے یو جی سی کو ایک پروجکٹ نوّے ہزار روپیہ کا بنا کر بھیجا جو اس نے منظور کر لیا، مگر کسی وجہ سے یونیورسٹی نے اسے نامنظور کر دیا... اس واقعہ سے میری علمی کاوشوں اور تمناؤں کو بڑی ٹھیس پہنچی!

پروفیسر بننے کا تو سوال ہی نہیں تھا! شملہ جاتے وقت پروفیسر شپ کے بارے میں جب میں نے علیم صاحب سے کہا تو انہوں نے اپنی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بس یہ ایک چیئر ہے، اگر آپ چاہیں تو میں اسے چھوڑ دوں؟ اس پر میں نے کہا کہ آپ مجھے شملہ جانے کی اجازت دیدیں۔"

شملہ جانے کے بعد مقبول صاحب کے مفاد کے لحاظ سے حالات اور بگڑے، سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے قیام کے ضمن میں اس کی تفصیل ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

"میں جس زمانے میں شملہ میں تھا علیم صاحب نے ہمارے پرانے شعبے یعنی عربی اور اسلامیات کو الگ الگ کر دیا تھا، اسلامک اسٹڈیز کو تو انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں شامل کر دیا گیا تھا اور عربی ڈیپارٹمنٹ کو

الگ شعبہ کی حیثیت دیدی تھی، یہ انہوں نے کس مصلحت کی بنا پر کیا تھا، مجھے اس کی بالکل اطلاع نہیں تھی۔

اس تقسیم کے بعد ایک دن مجھ سے پوچھا کہ آپ ان تینوں اداروں میں کس میں رہنا پسند کریں گے؟ میں نے جواب دیا کہ میرے لیے تینوں برابر ہیں، آپ جہاں چاہئے رکھ دیجئے۔ چنانچہ عربی مختار الدین آرزو (۲۱) صاحب کو اور اسلامک اسٹڈیز منیب الرحمٰن (۲۲) صاحب کو دیدیا گیا، میرے، لئے ظاہر ہے ویسٹ ایشین اسٹڈیز باقی رہ گیا تھا جس کا ابھی کوئی وجود نہ تھا! میری خواہش بھی نہیں تھی کہ میں علی گڑھ آکر اس نئے ادارہ کو قائم کروں۔

جب میں شملہ واپس جانے لگا تو علیم صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ آپ واپس جارہے ہیں اور کل ہی دہلی میں سنٹر کے ڈائرکٹر کا انتخاب ہونے والا ہے، آپ اس میں شریک ہو جائیں، اس کے بعد اگر آپ چاہیں تو یہاں آجایئے گا۔ دوسرے دن دہلی میں میرا انتخاب ہو گیا۔"

انتخاب کے بعد مقبول صاحب ۱۶/نومبر ۱۹۶۷ء میں علی گڑھ واپس آگئے، لیکن جنوری ۱۹۶۸ء میں علیم صاحب کے وائس چانسلر ہو جانے کی وجہ سے ان کو وہ آزادی نہ مل سکی جو ایک خود مختار شعبہ کے قیام کے لئے ضروری تھی، نیز قدیم مخالفتوں نے سر اٹھایا جن کا دراز سلسلہ عرصہ تک قائم رہا، اس دوہری پریشانی سے بھرے ہوئے پراگندہ ماحول کی تفصیل مقبول صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:

> "سنٹر کی تعمیر کے ابتدائی مراحل بڑے دشوار گزار تھے، اسے بنانا گویا جوئے شیر لانا تھا! سنٹر کے اپنے فیلوز ایسے نہ تھے جنہیں ہم فیلڈ ورک کے لئے عرب ممالک بھیجتے، اس لئے میں نے یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں کے لکچرار منتخب کر کے انہیں مصر، سعودی عرب وغیرہ بھیجا اور ان کے سارے اخراجات سنٹر نے برداشت کئے۔ سنٹر ایک منیجنگ کمیٹی کے ماتحت تھا جس

کے صدر وائس چانسلر تھے اور ڈائرکٹر اس کا سکریٹری تھا۔ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہ تھی، وہ نہ ٹیچنگ ڈیپارٹمنٹ تھا اور نہ ہی کسی فیکلٹی سے اس کا تعلق تھا، اس لئے ہم ایم فل اور پی ایچ ڈی کے داخلے بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض کرمفرماؤں کو یہ ادارہ بیحد کھٹک رہا تھا، اس لئے کہ اس کے پاس روپیہ بہت تھا، وہ اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اور اسے اپنے شعبہ کا ایک حصہ بنالینے کی فکر میں تھے، وہ یہاں تک مطالبہ کر رہے تھے کہ اس میں ویسٹ ایشیا سے متعلق جو کتابیں ہم جمع کر رہے تھے وہ پولٹیکل سائنس اور اقتصادیات کے شعبوں میں تقسیم ہو جائیں۔

اسی اثناء میں میرے خلاف ہنگامے برپا کئے گئے تاکہ میں تنگ آکر علی گڑھ چھوڑ دوں اور سنٹر ان کو ایک چاندی کی تھالی میں رکھ کر پیش کر دوں، لیکن یہ سب ان کا خواب وخیال تھا۔ وائس چانسلر نے بھی اس سنٹر کے مستقل قیام کی طرف توجہ نہ کی اور یہ غیر ثباتی صورت حال کئی برس تک قائم رہی!

بالآخر جب ڈاکٹر نورالحسن وزیر تعلیمات مقرر ہوئے اور پارلیمنٹ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کے سلسلہ میں نیا بل پیش ہوا تو انہوں نے اس سنٹر کو فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے شعبوں میں شامل کر دیا، اس طرح اسے ایک ڈیپارٹمنٹ آف اسٹڈیز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے یو.جی.سی کے سکریٹری مسٹر چھابڑا سے کہہ کر سنٹر کے لئے کئی پوسٹیں اور دوسری مراعات منظور کروائیں۔ اس طرح سنٹر کی قانونی حیثیت بھی مضبوط ہو گئی اور ہم نے ایم فل داخلے بھی شروع کر دیے اور سنٹر کا روپیہ سنٹر ہی کے اسکالرز پر خرچ ہونے لگا، کتابیں شائع ہونا شروع ہو گئیں، سمینار ہونے لگے، سنٹر کے علمی کارناموں کی وجہ سے ملک میں اس کا نام اور شہرت پیدا ہو گئی۔

سنٹر کو ختم کرنے کی ایک اور آخری کوشش بھی کر مفرماؤں نے کی مگر
اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی!"

یہ ہے ہمارے علم و فن کے بلند محلات (Ivory Towers) میں کام کرنے والے دانشوروں کے اردگرد کا ماحول جس میں وہ کبھی خود اپنے ہاتھوں ذہنی انتشار مول لیتے ہیں اور کبھی ناسازگار حالات ان کے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ میں نے اس پس منظر میں مقبول صاحب کے یونیورسٹی سے باہر اپنے مستقبل کی تلاش اور پھر پروفیسر اور ڈائرکٹر ہونے کے بعد سکون کی تلاش میں زیادہ تر بیرونی اسفار پر رہنے کو دیکھا ہے۔

استاذ زائر شملہ انسٹیٹیوٹ

شملہ میں پروفیسر نہار رنجن رائے نے ۱۹۶۵ء میں سماجی علوم اور فلسفہ پر اعلیٰ تحقیقی کام کے لئے Indian Institute of Advanced Study قائم کیا، مقبول صاحب کے الفاظ میں اس کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے:

> "یہ انسٹیٹیوٹ در حقیقت یونیورسٹی کے ان اسکالرز کے لئے قائم کیا گیا تھا جو یونیورسٹیوں کی سیاست اور ریشہ دوانیوں سے تنگ آجاتے تھے اور اپنی تحقیقات سکون کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں ایک اچھی اور پر سکون فضا میں یہ موقع انہیں مہیا کیا گیا تھا۔ اس میں مستقل ملازمتیں نہیں بلکہ دو دو تین تین سال کے لئے فیلوشپ دی جاتی تھی اور پروفیسر مقرر کئے جاتے تھے۔"

اس میں سب سے پہلے جن نامی گرامی اسکالرس کو مقرر کیا گیا ان میں مقبول صاحب بھی تھے، انہوں نے سکونِ خاطر کے لئے Visiting Professor کی حیثیت سے تقریباً دو سال (۶۶-۱۹۶۷ء) وہاں قیام کیا، انہوں نے وہاں سب سے پہلے اپنی کتاب Indo-Arab Relations مکمل کی جو ۱۹۶۷ء میں Indian Council for

Cultural Relations نئی دہلی کی طرف سے شائع ہوئی، پھر "قدیم عربی مآخذ میں ہند اور چین سے متعلق بیانات" پر داد تحقیق دی جو بعد میں شملہ انسٹیٹیوٹ کی طرف سے شائع ہوئی، اس کے علاوہ وہاں کے معمول کے مطابق لیکچر دیے، مقالات لکھے اور سمیناروں میں حصہ لیا جن کی روداد I.I.A.S.Transection میں شائع ہوتی رہی جیسا کہ اس کتاب کے آخر میں مقبول صاحب کی تحریروں کے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے۔

وہاں سے ۱۶/ نومبر ۱۹۶۷ء کو مقبول صاحب Centre of West Assian Studies کے پروفیسر اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے تردد کے ساتھ علی گڑھ واپس آئے جیسا کہ ان کی آپ بیتی میں لکھا ہے:

> "میری خواہش بھی نہیں تھی کہ میں علی گڑھ آکر اس نئے ادارہ کو قائم کروں... دوسرے دن دہلی میں میرا انتخاب ہو گیا۔ اس کے بعد میں غلام السیدین صاحب سے ملا جو شملہ انسٹیٹیوٹ کے گورننگ بورڈ کے ممبر تھے، میں نے ان سے رائے لی، انہوں نے کہا کہ اس نئے ادارہ کو قائم کرنا آپ کے لئے ایک چیلنج ہے! آپ اسے قائم کرنے کی کوشش کریں۔ دوسری طرف نواب علی یاور جنگ کی بات بھی میرے ذہن میں تھی۔ چنانچہ میں نے علی گڑھ واپس آنا طے کر لیا اور سنٹر کے قیام کی ابتدا کر دی۔
>
> ظہور وارڈ جہاں عربی اور اسلامیات کے شعبے تھے، اس کے زیادہ تر کمرے ان دو شعبوں میں بٹ چکے تھے، ہمارے لئے صرف ایک کمرہ باقی تھا، لائبریری کے دورازہ کے قریب ایک بے ڈھب سا کمرہ تھا جسے میں نے اپنا دفتر بنالیا، ابراہیم صاحب (۲۳) مرحوم جو سینئر کلرک تھے ان سے میں نے ایک پھٹا ہوا ٹاٹ لے لیا اور قالین کے طور پر بچھادیا اور عبدالعزیز میمن (۲۴) صاحب کے زمانہ کی ہاتھ سے بجانے والی ایک پرانی گھنٹی اپنی میز پر رکھ دی، لیجئے سنٹر شروع ہو گیا!"

اقتباس بالا میں نواب علی یاور جنگ کی جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ یہ تھی:

"میں جس زمانہ میں شملہ میں تھا علی گڑھ کے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ نے یو جی سی کو ایک تجویز بھیجی کہ ایریا اسٹڈیز کے پروگرام کے ماتحت علی گڑھ میں عرب ممالک سے متعلق ایک تحقیقی ادارہ یعنی سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز قائم کیا جائے، یہ تجویز یو جی سی نے منظور کرلی اور ۱۹۶۷ء میں جب میں شملہ واپس جارہا تھا، نواب صاحب نے مجھے بلا کر کہا تم اب شملہ سے واپس آجاؤ اور اس ادارہ کو قائم کرو، اگر تم نہیں آئے تو میں اسے شروع نہیں کروں گا۔"

مذکورہ بالا بے ڈھب کمرہ لائبریری کے باتھ روم کے سامنے ہے جس میں آج کل لائبریرین محمد کبیر صاحب بیٹھتے ہیں۔ مقبول صاحب کے الفاظ میں مزید کمروں کا انتظام اس طرح ہوا کہ جب وہ شملہ سے آئے:

"اس وقت تک علیم صاحب وائس چانسلر نہیں ہوئے تھے، میں نے ان سے اس بات کی رضامندی لے لی تھی کہ تینوں شعبوں کی متحدہ لائبریری کا میں انچارج رہوں گا، لائبریری کا نیا ہال تیار ہوگیا تھا چنانچہ میں نے پرانی لائبریری کی تمام کتابیں نئے ہال میں منتقل کرادیں اور پرانی لائبریری کے تین حصے کرادیے، جن میں سے ایک حصہ (۲۵) نئی لائبریری میں شامل ہوگیا اور دو کمرے (۲۶) سنٹر کے حصہ میں آگئے، میں نے اپنا دفتر ان میں سے ایک میں منتقل کردیا۔"

استاد زائر SOAS (اکتوبر ۱۹۷۴ء تا اپریل ۱۹۷۶ء)

مقبول صاحب کئی زبانیں جانتے تھے، اردو تو ان کی مادری زبان تھی ہی، اس کے علاوہ عربی، فارسی سے بخوبی واقف تھے، گجراتی، ہندی اور فرنچ وغیرہ پڑھ اور سمجھ

لیتے تھے، کچھ اور زبانوں میں بھی شُدبُد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جیسے ترکی اور اٹالین وغیرہ، مہارت کے لحاظ سے انگریزی ان کی تصنیفی زندگی کی اصل زبان تھی۔

اہل وعیال سے ملاقات کے لئے ۱۹۷۳ء میں لندن پہنچے تو وہاں ان کی ملاقات Prof. A.K.S.Lambton سے ہوئی جو اس وقت لندن یونیورسٹی کے School of Oriental and African Studies کے شعبۂ Middle Eastern Studies کی صدر تھیں، انہوں نے فارسی زبان کی "تاریخ حافظ ابرو" کو ایڈٹ کرنے کی تجویز رکھی اور اس کے لئے SOAS کی وزٹنگ فیلوشپ کی پیشکش کی۔ اب تک مقبول صاحب نے عربی کی دو اہم کتابیں ایڈٹ کی تھی، فارسی کی یہ پہلی کتاب تھی، اہل وعیال کے قرب اور لندن کے قیام کے شوق میں اس بالکل نئے کام کو قبول کرلیا، ہندوستان واپس آئے تو کچھ عرصہ بعد مسز لیمبٹن نے حسب وعدہ فیلوشپ کی اطلاع دی اور اکتوبر ۱۹۷۴ء تک جوائن کرنے کا وقت دیا۔

اسی دوران پروفیسر نورالحسن اور نواب علی یاور جنگ کی معرفت معلوم ہوا کہ مسز اندرا گاندھی ان کو کسی عرب ملک کا سفیر بنا کر بھیجنا چاہتی ہیں، مقبول صاحب نے اگرچہ الجیریا کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کردیا تھا لیکن SOAS کی فیلوشپ کی اطلاع ملتے ہی اس علمی کام کو ترجیح دی اور انگلینڈ پہنچ کر برٹش میوزیم، باڈلین، آکسفورڈ اور تہران کے مخطوطات کی روشنی میں اس کتاب کی تحقیق کے کام میں پوری سرگرمی سے مشغول ہوگئے، ہر ہفتہ مسز لیمبٹن سے مشورہ ہوتا اور کام تیزی سے آگے بڑھتا رہتا، یہاں تک کہ مارچ ۱۹۷۶ء تک ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک ہزار صفحات میں اس کی تکمیل ہوئی اور متعلقہ شعبہ میں اس کی فوٹو کاپی لندن میں تقریباً دو سالہ قیام (۷۴-۱۹۷۶ء) کے بعد واپسی سے قبل جمع ہوگئی، افسوس کہ ابتک وہ غیر مطبوعہ ہے۔ اپریل ۱۹۷۶ء میں ہندوستان واپسی ہوئی۔

رکنیت یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (۷۶-۱۹۷۹ء)

اسی قیام لندن کے آخر میں اطلاع ملی کہ University Grants Commission, New Delhi کی سہ سالہ رکنیت (۷۶-۱۹۷۹ء) کے لئے مقبول صاحب کا انتخاب ہوا ہے، مذکورہ بالا تحقیقی کام کی تکمیل تو ہو ہی چکی تھی، اہل و عیال سے جدائی کے خیال سے اگر فوری ہندوستان واپسی میں کوئی تردد تھا تو خاکسار (جو اس وقت کامن ویلتھ اکیڈمک اسٹاف فیلو کی حیثیت سے ایک تعلیمی سال کے لئے لندن میں مقیم تھا) اور علی گڑھ کے دوسرے رفقاء کے مشورے اور اصرار سے وہ واپس ہوئے کہ خلق خدا کی خدمت کا جو نادر موقعہ ہاتھ آیا ہے اس سے متعلقہ اداروں کو فائدہ پہنچے۔ UGC کمیشن کی رکنیت کے ساتھ اس کی Area Studies Committee کے ممبر بھی بنائے گئے ان دونوں رکنیتوں کی برکت سے دیگر اداروں کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کو عموماً اور سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کو خصوصاً بہت منافع حاصل ہوئے، سنٹر کی مذکورہ بالا تدریسی و غیر تدریسی آسامیوں اور متعدد مالیاتی فنڈز کے علاوہ سنٹر کی نئی عمارت بھی ان کے دورِ رکنیت ہی کی یادگار ہے۔

اس رکنیت کے دوران معمول کے علاوہ پانچ سالہ معائنہ کی UGC Review Committees کے صدر اور بعد میں رکن کی حیثیت سے مختلف یونیورسٹیوں کے معائنہ کے لئے بار بار سفر کرتے رہے اور ان کو ممکنہ مدد پہنچاتے رہے، ایسے جن اداروں کے نام معلوم ہو سکے وہ درج ذیل ہیں:

As President:

- ☆ Vishwa Bharti, Shantiniketan,
- ☆ Jamia Millia Islamia, New Delhi,
- ☆ Kashi Vidyapith, Varanasi,

As Member:

- ☆ Bhobneshwar University and Other Universites of Orisa,
- ☆ Kashmir University, Srinagar, 1978-79

اس کے علاوہ مرکزی وزارت تعلیم نے ان کی صدارت میں دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد (قائم شدہ ۱۸۸۸ء) کے معائنہ کے لئے ایک Review Committee ستمبر ۱۹۷۲ء میں بھیجی تھی، اس کمیٹی نے حکومت ہند سے سفارش کی کہ اس کو ایک قومی ادارہ مانا جائے، اس کے پچاس فیصدی مصارف مرکزی حکومت ہند برداشت کرے، اس کے کارکنان کی ملازمت مستقل کر کے تنخواہ بڑھائی جائے، اضافی جگہ کے لئے نیا ہال تعمیر ہو اور Monotype Press کی خریداری کا انتظام کیا جائے۔

اس کے بعد وزارت تعلیم ہی کی طرف سے یوپی، بہار، آسام، بنگال وغیرہ کے عربی مدارس کی گرانٹ پر نظر ثانی کرنے کا کام مقبول صاحب کے سپرد ہوا۔ ان مدارس کی حالت بھی بہت خستہ تھی، اور ان کے مدرسین کی تنخواہیں ناقابل بیان حد تک کم تھیں۔ ضروری اضافوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان مدارس کی گرانٹ میں اضافہ تجویز ہوا جس سے پہلے کے مقابلہ میں حالت بہتر ہوئی۔

بھوپال میں اسکول آف کمپریٹیو لینگویجز اینڈ کلچر کا قیام

۱۹۷۲ء میں بھوپال یونیورسٹی (حال برکت اللہ خاں یونیورسٹی بھوپال) قائم ہوئی، اس کے وائس چانسر پروفیسر روی پرکاش ماتھر کو اس میں مشرقی زبانوں اور تہذیب کے مطالعات کے شعبہ کے قیام کی فکر دامنگیر ہوئی، مقبول صاحب سے مشورہ کیا، پھر تفصیلات طے کرنے کے لئے پروفیسر محمد زبیر صاحب صدیقی (صدر شعبۂ عربی حمیدیہ کالج بھوپال) کو کئی بار علی گڑھ بھیجا اور پورے غور و خوض کے بعد بھوپال یونیورسٹی میں School of Comparative Languages and Culture زبیر صاحب کی سرکردگی میں قائم ہوا جس میں مقبول صاحب کی رہنمائی کا بڑا حصہ تھا۔ آج یہ اسکول تین مستقل بالذات شعبوں: عربی، فارسی اور سنسکرت و لسانیات میں تقسیم ہو کر پھل پھول رہا ہے۔

کشمیر میں سنٹر آف سنٹرل ایشین اسٹڈیز کا قیام (مئی ۷۹-اکتوبر ۱۹۸۴ء)

علی گڑھ سے ۱۹۷۹ء میں رٹائرمنٹ کے ساتھ تحقیق و ریسرچ کے کامیاب ادارے قائم کرنے میں مقبول صاحب کی صلاحیت ملک میں معروف ہو چکی تھی، اس وقت کے وزیر اعلیٰ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ (وفات ۱۹۸۳ء) کو ایک ایسے تحقیقی ادارہ کی ضرورت محسوس ہوئی جو کشمیر اور سنٹرل ایشیا کی تہذیب و تمدن متنوع قدیم تعلقات اور جدید امکانات پر ریسرچ کے لئے مخصوص ہو۔ انہوں نے پروفیسر رئیس احمد (وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) سے مشورہ کے بعد مقبول صاحب کو براہ راست خط لکھا جس میں ان سے تعاون کی خواہش کا اظہار کیا، اس خواہش کے احترام میں مقبول صاحب مئی ۱۹۷۹ء میں کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور وہاں Centre for Central Asian Studies کی بنیاد رکھی اور اس کو مستحکم کیا۔

اس کے ایک تعارفی Brochure میں مقبول صاحب نے اس کے اغراض و مقاصد کو واضح کیا اور سنٹرل ایشیا کے حدود کا تعین کرتے ہوئے اس میں تاجکستان، ازبکستان، کرغیزیا، آذربائیجان، ترکمانستان، قزاقستان کے علاوہ ایران، افغانستان اور منگولیا کو بھی شامل کیا، موضوعات اور زمانہ کی کوئی قید نہ رکھی، علاقہ کی زبانوں کی تعلیم پر زور دیا، چنانچہ منگولیا سے دو فیلوشپ حاصل کر کے دو لڑکیوں: مقصودہ صرفی (ایک جاپانی سے شادی کے بعد میشوتانی) اور وملا کو زبان سیکھنے کے لئے الن باتور بھیجا اور منگولین زبان کی ایک لیکچرر شپ قائم کرائی، سنٹر میں روسی زبان سکھانے کا بھی انتظام تھا۔ مضامین کے لحاظ سے اس کے تقریباً پندرہ سیکشن تھے جن میں قدیم و جدید زمانہ کی کوئی قید نہ تھی۔ اسٹاف کی تعداد تقریباً پندرہ ہو گئی تھی۔ Tajik Academy of Science, Tajikistan اور سنٹر کے درمیان ثقافتی تبادلہ کا معاہدہ کرایا۔ خود اپنی اور دیگر رفقا کی نگرانی میں چوبیس ایم فل اور دو پی ایچ ڈی مقالے مکمل کرائے اور سنٹر سے

چھ سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔

۱۹۸۱ء میں شیخ عبداللہ صاحب ہی کی خواہش پر کشمیر یونیورسٹی لائبریری کے گراؤنڈ فلور کے بڑے ہال میں Central Asian Museam سجایا، اس کے نصف سے زیادہ تحائف کا انتخاب Sri Pratap Museam Srinagar سے کیا گیا تھا، ان میں سے بعض بیش قیمت تحائف سنٹرل ایشیا سے متعلق تھے، فاروق عبداللہ صاحب اور دیگر اشخاص نے بھی نادر تحفے اس کو ہدیہ کئے، افتتاح کے بعد خود شیخ صاحب نے شاہی خزانہ سے بہت سے قیمتی تحفے عنایت کئے۔

شہر کی ایک لائبریری میں سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کے مخطوطات کا ایک قیمتی ذخیرہ حفاظت اور دیکھ بھال کا محتاج تھا، شیخ صاحب کی خواہش پر اس کو بھی کشمیر یونیورسٹی منتقل کیا گیا اور مقبول صاحب اسکے انچارج مقرر ہوئے۔

اسی کے ساتھ ۱۹۸۰ء میں وہاں شعبۂ عربی قائم کر کے اسکے صدر کی حیثیت سے اس کے استحکام کے لئے بھی کوشاں رہے، ایم اے کا ایک پرچہ خود پڑھاتے تھے، اس شعبہ کے لئے انہیں V.C. نے ایک لیکچرر کے تقرر کی منظوری دی تھی، دیگر عربی داں اساتذہ اور فیلوز سے درخواست کی گئی چار پانچ اساتذہ کی مدد سے کلاس شروع ہو گئے۔ اور ڈاکٹر ریاض الرحمن خاں صاحب شیروانی کے ۱۹۸۳ء میں پروفیسر و صدر مقرر ہونے تک اس کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی طرح اس یونیورسٹی میں سنسکرت کا شعبہ قائم کرنے میں بھی مدد کی، شعبۂ تاریخ میں اسلامی تاریخ کا کورس پڑھایا اور یونیورسٹی میں کئی سمینار منعقد کئے اور دیگر شعبوں کے سمیناروں میں حصہ لیا۔

اس سرگرم علمی و عملی زندگی کے تقریباً ساڑھے پانچ سال بعد کشمیر یونیورسٹی سے اکتوبر ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ واپس ہوئے۔ واپسی سے پہلے اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہونے کی تجویز بھی چلی تھی لیکن غالباً پینسٹھ سال سے زیادہ کی عمر حائل ہوئی۔

اعزازی ڈاکٹریٹ کشمیر یونیورسٹی

کشمیر یونیورسٹی کے لئے مقبول صاحب کی ان ہمہ جہت مخلصانہ خدمات کا اعتراف پروفیسر مشیر الحق صاحب کے سہ سالہ دور وائس چانسلری (۸۷-۱۹۹۰ء) میں اس وقت ہوا جب کشمیر یونیورسٹی نے عربی اور اسلامی مطالعات کے میدان میں مقبول صاحب کی ناموری اور بیشمار خدمات کے اعتراف میں ان کو Doctor of Letters (Honoris Causa) عطا کرنے کا فیصلہ کیا، یہ اعزازی ڈگری ان کو یونیورسٹی کے سالانہ کنووکیشن میں ۹ر ستمبر ۱۹۸۹ء کو پیش کی گئی۔

اعزازی سند منجانب صدر جمہوریہ ہند

اس سے پہلے ۱۹۸۴ء میں عربی زبان وادب کی وسیع معلومات اور اس موضوع پر عظیم خدمات کے اعتراف کے طور پر صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ، مقبول صاحب کو Certificate of Honour in Arabic کا اعزاز عطا کر چکے تھے، جس میں اعزازی سند اور ایک قیمتی شال کے ساتھ تاحیات ایک مقررہ رقم بطور وظیفہ ملتی رہتی ہے، غالباً اس وقت اس کی رقم دس ہزار روپیہ سالانہ تھی اور اب بیس ہزار روپیہ سالانہ ہے۔ اس خوشی میں حلقۂ احباب ناگپور نے ۱۶ر جنوری ۱۹۸۵ء کو استقبالیہ دیا جس میں ان کو منظوم سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا، خود مقبول صاحب نے "اسلامی علوم وفنون کی ترقی" پر تقریر کی، اس استقبالیہ میں مقبول صاحب کی بہن آفتاب بیگم عرف شہر بانو بھی شریک تھیں۔ پھر ۱۵ر مارچ ۱۹۸۵ء کو راشٹر پتی بھون میں خطابات وانعامات کی تقسیم کی تقریب منعقد ہوئی، اس میں شرکت کے لئے مقبول صاحب کی بیگم لندن سے خاص طور پر تشریف لائیں اور ۲۰ر مارچ کو واپس ہوئیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی (اگست ۸۹-دسمبر ۱۹۹۱ء)

پنشن کے کچھ عرصہ بعد پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی نے اصرار کے ساتھ سرکاری خدمات سے سبکدوشی اختیار کی تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذمہ داروں کو کے Dr. Zakir Husain Institute of Islamic Studies, New Delhi. متنوع علمی و تحقیقی اور اشاعتی کاموں کی نگرانی کے لئے ایک تجربہ کار و مستعد اور منتظم اسکالر کی ضرورت محسوس ہوئی، شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید ظہور قاسم نے مقبول صاحب کو آمادہ کر کے ۱۹۸۹ء میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے دوسال کے لئے ان کی خدمات حاصل کیں، انہوں نے ۱۹۹۱ء تک اس کے علمی وانتظامی کاموں کی دیکھ بھال کے فرائض انجام دیئے اور اس کے اشاعتی شعبہ کو مستحکم کیا، خاص طور پر اس کے اردو اور انگلش سہ ماہی رسالوں کی وقت پر اشاعت کی فکر ان کو ہر وقت دامنگیر رہتی تھی اور ہر اہل قلم ملاقاتی سے ان کے لئے مقالات کے طالب رہتے تھے، اس زمانہ میں خود ان کے بعض مقالات ان رسالوں میں چھپے۔

قدیم شماروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "اسلام اور عصر جدید" (اکتوبر ۱۹۸۹ء تا جولائی ۱۹۹۱ء) اور Islam and Modern Age (اگست ۱۹۸۹ء تا اگست ۱۹۹۱ء) کے دوسال مدیر اعلی رہے۔ ان دونوں رسالوں کے ایڈیٹوریل بورڈ میں ان کا نام نامی از ابتدائے رسائل تا وفات رہا۔ مقبول صاحب نے اپنی غیر مطبوعہ آپ بیتی میں لکھا ہے کہ میں نے جامعہ میں تقریباً ڈھائی سال گزارے اور ۳۱/دسمبر ۱۹۹۱ء کو اسے خیر باد کہا۔

عربی سہ ماہی ثقافۃ الھند کی ادارت (۷۱-۱۹۸۳ء)

ان دونوں رسائل کے علاوہ کئی دیگر علمی جرائد ورسائل کی مجالس ادارت میں

ان کا نام شامل تھا جیسے:

Journal of History of Science in India, New Delhi.
Bulletin of the Institue of Islamic Studies, Aligarh,
Majallah Ulcom-e-Islamia, Aligarh.
News Bulletin of Jamia Millia Islamia, New Delhi.

وغیرہ۔ پہلے گذر چکا ہے کہ "مسلم یونیورسٹی گزٹ" کی ادارت بھی بہت پہلے کئی سال کر چکے تھے۔ عرصہ سے ڈاکٹر شمعون طیب علی لوکھنڈ والا Indian Council fo Cultural Relations, New Delhi کے سہ ماہی عربی ترجمان ثقافۃ الھند کے مدیر اعلیٰ تھے، ان کے بعد جب مجلس کو ایک نئے مدیر کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کی نظر انتخاب مقبول صاحب پر پڑی، اپریل ۱۹۷۱ء تا اپریل ۱۹۸۳ء مقبول صاحب اس کے مدیر اعلیٰ رہے اور جناب صدرالدین عامر انصاری تا وفات اس کے نائب مدیر تھے، دونوں کے تعاون سے یہ رسالہ تیرہ سال پابندی سے نکلتا رہا لیکن انصاری صاحب کی وفات کے بعد اس کے نظم و نسق میں خلل پڑا، پھر غالباً ۱۹۸۵ میں پروفیسر نثار احمد فاروقی (۲۷) (دہلی یونیورسٹی) نے اس کی ادارت سنبھالی تو اس میں جان پڑی اور اب وہ پروفیسر زبیر احمد فاروقی (۲۸) کی ادارت میں پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ مقبول صاحب کو مختلف زبانوں کے علمی جرائد و رسائل کی ترتیب و تہذیب اور ادارت کا بھی بڑا تجربہ تھا۔

آل البیت یونیورسٹی، مفرق، اردن کی ملازمت (ستمبر ۹۴-دسمبر ۱۹۹۵ء)

نئے نئے تعلیمی و تحقیقی ادارے قائم کرنے میں مقبول صاحب کی شہرت اور ساکھ ہندوستان سے باہر بھی پہنچ گئی تھی، اردن کے پایۂ تخت عمان سے پچھتر میل دور المفرق میں آل البیت یونیورسٹی قائم ہوئی، اس کے صدر ڈاکٹر محمد عدنان البخیت نے مقبول صاحب کے وسیع اور متنوع تجربہ سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس کی، پہلے ان سے مختلف شعبوں کے قیام و انتظام میں صلاح و مشورہ کرتے رہے، پھر اس کو ناکافی

سمجھ کر عزت واحترام کے ساتھ جغرافیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی بلالیا۔ ساجد کے نام خط مؤرخہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۹۴ء میں خود مقبول صاحب نے لکھا ہے کہ وہ دہلی سے عمّان ۱۲ر ستمبر ۱۹۹۴ء کو پہنچے تھے اور Full Professor کی حیثیت سے اس یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے منسلک ہوئے تھے اور Teachers` Quarters میں ان کا قیام تھا۔

بخیت صاحب نے اسلامی جغرافیہ کی تاریخ عام پر مقبول صاحب کی علمی زندگی کی حاصلِ مطالعہ کتاب دیکھی تو فوراً اس کو اپنی یونیورسٹی سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا، اشاعت سے پہلے نظر ثانی کرنے کے لئے تمام سہولتیں فراہم کیں اور اس کو A History of Arab Islamic Geography کے نام سے اعلیٰ معیار پر جولائی ۱۹۹۵ء میں شائع کیا، پھر ان کو اس وقت تک روکے رکھا جب تک کہ وہ خود اپنی کینسر کی مہلک بیماری کے بعد وہاں جانے سے معذور نہ ہوگئے۔ ساجد کے نام خط مؤرخہ ۳ر جنوری ۱۹۹۶ء کی رو سے مقبول صاحب آخری بار اردن سے لندن ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۵ء کو پہنچے تھے، جہاں پھیپھڑے میں کینسر کا پتا چلا، اس کی تفصیل راقم کے نام خط مؤرخہ ۸ر مئی ۱۹۹۶ء میں اس طرح تحریر کی ہے:

"میں لندن میں تقریباً چار مہینے سے ہوں، دسمبر (۱۹۹۵ء) میں جارڈن سے یہاں تعطیلات میں آیا تھا، پہلے سے کھانسی سخت تھی اور کمر میں درد بھی تھا، یہاں آکر تفتیش کروائی تو ۱۴ر مارچ (۱۹۹۶ء) کو پتہ چلا کہ میرے دائیں جانب کے پھیپھڑے میں Lung Cancer ہے، مگر ابھی چھوٹا اور نیا ہے۔ بہر حال طرح طرح کی فکریں لاحق ہو گئیں!

ڈاکٹروں نے رائے دی کہ فوراً Chemotherapy کا علاج شروع ہو جانا چاہئیے۔ علاج لمبا اور دیرپا ہے، کم از کم اگست تک یہ علاج جاری رہے گا، پہلا انجکشن یکم اپریل کو لگا اور ہر تین ہفتہ کے بعد لگ رہے ہیں، مگر چونکہ میری عام صحت اچھی ہے اس لئے کوئی Side effect نہیں ہوئے اور نہ ہی

Reaction، اب تیسرے انجکشن ۱۳ر مئی کو لگیں گے۔

اب طبیعت بہت بہتر ہے اور امید ہے کہ ان شاء اللہ تین چار مہینہ میں بالکل صحت مند ہو جاؤں گا، ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال ہے۔ بہر حال زندگی تو مشیت ایزدی کی ماتحت ہے اور ہر انسان کو کبھی نہ کبھی جانا ہے!

جارڈن میں میری کتاب جس پر میں برسوں سے ریسرچ کر رہا تھا (۱۹۹۵ء میں) شائع ہو گئی تھی، اس کا عنوان ہے A History of Arab-Islamic Georaphy اور جامعۃ آل البیت، مفرق کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور شاہ حسین کے نام معنون ہے۔ بہر حال یہ ایک کام تھا جس کی اشاعت کی مجھے برسوں سے فکر تھی۔

اگر آپ سنٹر کی لائبریری سے کہدیں کہ وہ جارڈن سے یہ کتاب منگوا سکتے ہیں۔ وہ ایک خط ڈاکٹر محمد عدنان البخیت، رئیس جامعۃ آل البیت، مفرق، جارڈن کو لکھدیں تو وہ ایک کاپی بھیج دیں گے۔ میں ان شاء اللہ ستمبر تک جارڈن واپس جاؤں گا اور اکتوبر نومبر تک ہندوستان آؤنگا۔"

میں نے عیادت کے خط میں فکر و پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے خیریت دریافت کی تو خط مؤرخہ ۷ر جون ۱۹۹۶ء میں تحریر فرمایا:

"اس خط سے الگ میں اپنی کتاب بذریعہ ایر میل آپ کے لئے روانہ کر رہا ہوں، امید ہے آٹھ دس دن میں مل جائیگی۔ آپ چاہیں تو سنٹر میں دوستوں کو دکھا سکتے ہیں۔ نثار اور ساجد کو ضرور دکھادیں کہ ان کا نام شکریہ میں شامل ہے۔ ڈاکٹر بخیت آپ کو (سنٹر کی لائبریری کے لئے) ضرور میری کتاب روانہ کر دینگے...

میرا پروگرام اب یہ ہے بشرطیکہ طبیعت اچھی رہی، نومبر دسمبر میں ہندوستان آؤنگا اور وہاں تین چار مہینے رہنے کے بعد جون میں رائل اکاڈیمی کی

میٹنگ کے لئے جارڈن جاؤں گا اور پھر وہاں سے لندن۔

میری طبیعت اب خدا کا شکر ہے بہت بہتر ہے، کھانسی ختم ہو گئی ہے، X-Ray میں اب وہ دھبے بھی نظر نہیں آتے جو دائیں بازو کے پھیپھڑے میں تھے، بلڈ کاؤنٹ بھی نارمل ہے یعنی ۱۵، اب دو کیموتھراپی کے انجکشن لگنا باقی ہیں جو جون اور جولائی میں لگیں گے، پھر Radio Therapy کا علاج اگست میں ہوگا۔ ڈاکٹر سب مطمئن ہیں کہ صحت بہتر ہو رہی ہے اور آڈری (بیگم مکتوب نگار) بھی مطمئن ہیں۔

میرا مزاج یہ ہے کہ میں کسی بیماری یا آفت ناگہانی سے پریشان نہیں ہوتا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ کینسر ہے تو میں پریشان نہیں ہوا بلکہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ کیسے ہو گیا؟ اس کے بعد علاج کی طرف سختی سے توجہ کی، سب سے پہلے تو سگریٹ چھوڑ دی کیوں کہ یہی اس کی اصل جڑ تھی، اب تین مہینے سے سگریٹ چھوڑ دی ہے اور آئندہ بھی نہیں پیونگا۔ پچھلے سال جارڈن میں جب کتاب میں مشغول تھا تو بیحد پی رہا تھا اور کھانسی بھی سخت تھی، مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ کینسر شروع ہو گیا ہے۔ غنیمت ہے لندن میں جب اپنے ڈاکٹر سے ملا تو انہیں X-Ray دیکھ کر شبہ ہوا، پھر دوسرے ٹیسٹ شروع ہو گئے، غرضکہ مارچ میں اندازہ ہوا کہ کینسر ہے۔ انگلینڈ میں علاج بہترین اور مفت ہوتا ہے بشرطیکہ آپ نیشنل ہیلتھ سروس (N.H.S.) کے ممبر ہوں۔

اب آپ بھی مہربانی فرما کر فوراً سگریٹ ترک کر دیجئے، یہ میرا بزرگانہ اور دوستانہ مشورہ ہے۔ بڑی موذی عادت ہے! اب نہیں تو دس بیس سال میں اندازہ ہو گا۔ اگر آپ نے نہیں چھوڑی تو میں منّی بیگم (بیگم مکتوب الیہ) کو لکھوں گا کہ وہ آپ کا دانہ پانی بند کر دیں اور چھڑوا کر چین لیں..."

ان طویل اقتباسات میں مقبول صاحب کی آخری بیماری کی تفصیل خود ان کے قلم سے آگئی ہے، جہاں تک ان کی ہندوستان آمد کا تعلق ہے تو وہ پروگرام کے مطابق ۹ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو تین ماہ کے لئے براہ دہلی ہندوستان تشریف لائے، آمدورفت دونوں میں چند دن کے لئے علی گڑھ آئے، بیشتر حصہ بہن آفتاب بیگم عرف شہر بانو کے ساتھ ونی (ناگپور) میں گذارا، پھر براہ راست دہلی سے لندن ۵ر مارچ ۱۹۹۷ء کو روانہ ہوگئے، اردن نہ جاسکے۔ آٹھ ماہ کے اندر پھر ۲۱ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کو آخری بار ہندستان تشریف لائے، دو دن علی گڑھ قیام کے بعد ۲۴ر اکتوبر کو ونی کے لئے روانہ ہوئے اور ۲۱ر فروری ۱۹۹۸ء کو بمبئی کی خاک میں پیوست ہوگئے ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اس طرح ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۵ء کے بعد جامعۃ آل البیت تو کیا Royal Jordanian Academy for Islamic Civilization Research کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے بھی دوبارہ اردن نہ جاسکے جس کے وہ اس کی ابتداء ۱۹۸۵ء سے رکن تھے اور اس کی اجلاسوں میں اہتمام سے شرکت کرتے تھے۔

علمی اور تحقیقی اداروں کی رکنیت

تعلیمی و تصنیفی زندگی میں علمی اداروں کی رکنیت اور ان سے وابستگی بھی بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے، اس اعتبار سے بھی مقبول صاحب کا صفحۂ زندگی بھرا ہوا ہے، بعض اداروں کے نام اوپر گذر چکے ہیں، دیگر نام یہ ہیں:

Fellow of the Royal Geographical Society, London, 1948-56.

Fellow of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland, London, 1976.

Member of the National Geographical Society, Cairo, Egypt,1964

Member of the German Oriental Society, Sinco 1967.
Member of the Hakluyt Society, London,1976.
Member of the Executive Committee of Indian Council for Social Science Research, New Delhi, 1971-81,
Member of National Commission for Compilation of History of Science in India, Indian National Science Academy, New Delhi.
Member of Arab Historians Conference, Baghdad.
Member of Editorial Board ofUNESCO'S Publicatins of Islamic Science.

ان کے علاوہ درج ذیل یونیورسٹیوں کی اعلیٰ علمی مجالس کے رکن بھی رہ چکے تھے۔

Sansad Vishvabharti, Shantiniketan.
Delhi University, Delhi.
Jamia Millia Islamia, New Delhi.

فصل سوم

غیر ملکی اسفار

مسلم جغرافیہ داں مؤرخ گھر بیٹھ کر جغرافیہ نگاری کے عادی نہیں تھے، بلکہ اپنے مطالعہ کی تصدیق کے لئے ذاتی مشاہدات کو بھی بنیاد بناتے تھے، اس کے لئے وہ اس وقت کی جوکھم بھری سیاحت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے تھے اور بحر و برّ کے قلابے ملا ڈالتے تھے۔ بیسویں صدی میں ملک در ملک نقل و حرکت کی راہ میں لالچی اور خوفزدہ قومی حکومتوں کی ساختہ پرداختہ پابندیوں کے باجود قدرت نے مقبول صاحب کو دنیا کی سیاحت کے بیش بہا مواقع سے بھی خوب نوازا تھا۔

ابتدا سے بھی کچھ ایسے آثار تھے، اوپر گذر چکا ہے کہ مقبول صاحب کے خاندان کا اصل تعلق بریلی سے تھا، پھر ان کی ولادت مدھیہ بھارت کی پٹھاری ریاست میں، ابتدائی نشو و نما بھوپال میں، اسکول و کالج کی تعلیم بمبئی میں اور اعلیٰ تعلیم انگلینڈ میں ہوئی۔ ہندوستان واپس آئے اور ان کے علمی کام شائع ہونا شروع ہوئے تو علمی حلقوں میں روشناسی بڑھی اور بتدریج ایک طرح سے ملک و بیرون ملک علمی سفروں کا تانتا لگ گیا۔ قابل قدر بات یہ ہے کہ یہ اسفار محض تفریح طبع کا بہانہ نہیں ہوتے تھے بلکہ ان سے تاریخی اور جغرافیائی مطالعہ کے تصدیقی مشاہدہ کا کام بھی پیش نظر ہوتا تھا، خود مقبول صاحب نے اپنی آخری کتاب جغرافیہ اسلامی کی تاریخ عام کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> "میں اپنے ایشیا اور شمالی افریقہ کے سفروں کے دوران مسلسل کوشش کرتا تھا کہ مختلف قدیم شہروں اور بندرگاہوں کا پتہ لگاؤں اور قرون وسطیٰ کے ممتاز مسلم علماء کے مزاروں کی بھی تلاش کروں۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء کے سفر مصر میں فسطاط (قدیم قاہرہ) گیا اور مسعودی کی قبر تلاش کی اگرچہ کامیابی نہ ہوئی۔

۱۹۷۳ء کے سفر غزنہ (افغانستان) میں بیرونی کے مزار کی کھوج میں نکلا، وہ باغ تو مل گیا جہاں کہا جاتا ہے کہ وہ مدفون ہوئے لیکن متعین طور پر ان کی قبر نہ مل سکی۔ ہندستان میں (Quilon,Kerala) Kullam, Malay بندرگارہ کے جائے وقوع کو مبہم طور پر سہی تقریباً متعین کرلیا تھا۔ ملایا کے سفر میں قدیم بندرگاہ Kalah کی تلاش میں Kedah گیا جس کا عرب تاجروں اور سیاحوں کے بیانات میں بہت تذکرہ آتا ہے۔

سب سے زیادہ مہم جویانہ دلچسپ بحری سفر ۱۹۶۴ء میں بصرہ سے بمبئی کا تھا، یہ وہی راستہ تھا جس سے مسعودی دوبار ہندوستان کے سفر بصرہ سے تانا (مہاراشٹر کا ضلع تھانہ) گئے تھے، میں نے بھی اس کے نقشِ راہ کی پیروی میں بصرہ سے بمبئی کا سفر کیا کہ شاید مسعودی کے مشاہدات کا کچھ اندازہ مجھے بھی ہوسکے اور اس کے بحری سفر کے احساسات کو میں بھی اپنے اندر بیدار کرسکوں۔

۱۹۸۳ء میں تاجکستان کی زیارت کے موقع پر سمرقند گیا اور میں نے الغ بیگ کی تعمیر کردہ رصدگاہ دیکھی جس کی موجودہ صدی میں دریافت نو ہوئی تھی۔"

پھر یہ بات مقبول صاحب تک ہی محدود نہ تھی، ان کے چھوٹے سے خاندان کا بھی کچھ یہی حال ہے، ایک وقت ایسا بھی یاد آتا ہے جب ان کے پانچ رکنی خاندان کا ہر فرد الگ الگ ممالک میں مختلف اغراض سے بکھرا ہوا تھا: خود مقبول صاحب کشمیر میں، بیگم کسی امدادی مشن کے ساتھ سنٹرل ایشیا یا افریقہ میں، بڑی بیٹی بغرض ملازمت ملیشیا میں، دونوں جڑواں بیٹیوں میں سے ایک لندن میں اور دوسری یورپ یا امریکہ کی سیاحت پر ؎

ایک دل کے ٹکڑے ہوئے ہزار　　کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

بہر حال تعلیم کے زمانہ کے کثیر اسفار، بعد میں اہل و عیال سے ملاقات کے لئے انگلینڈ کے سفر اور ملازمت کی غرض سے اردن کے سفروں کو چھوڑ کر کہ ان کا ذکر اوپر کسی نہ کسی سیاق میں گذر چکا ہے باقی علمی و معلوماتی اور تفریحی بیرونی اسفار کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے جن کے بارے میں ہم کو کچھ معلومات دستیاب ہیں:

عرب ممالک کا پہلا سفر (۲۷ر فروری- ۱۳ر مئی ۱۹۶۴ء)

مصر: (۱۳ر مارچ-۷ر اپریل ۱۹۶۴ء)

ہندوستان میں عرب لیگ مشن نے ۱۹۶۴ء میں مقبول صاحب کو مصر و لبنان اور شام و عراق کے تعلیمی اداروں میں لیکچر دینے کے لئے ماہ دوماہ کے علمی سفر پر بھیجا تھا، ان کی علمی زندگی میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا جس کے بعد یہ گویا ایک طرح سے ان کا معمول حیات بن گیا۔ اس سفر کا پورا قیام قاہرہ ہی میں رہا اس لئے مصر کے دیگر شہر اور ان کے تاریخی مقامات دیکھنے کا موقع نہ ملا، قاہرہ ہی کے لاتعداد ناموارانِ علم و ادب اور اہل صحافت سے ملاقاتیں رہیں، قدیم تاریخی آثار دیکھے، متعدد تعلیمی اداروں کی زیارت ہوئی اور وہاں لیکچر ہوئے جیسے امریکن یونیورسٹی، قاہرہ میں تقریر کا اہتمام مقبول صاحب کے قدیم دوست پروفیسر عباس حسین ہمدانی (۲۹) نے کیا، عرب لیگ کے زیر انتظام معہد الدراسات العالیۃ اور معہد الدراسات العربیۃ العالیۃ میں ہندوستان کے عربوں کے ساتھ ثقافتی اور سیاسی تعلقات پر دو لیکچر ہوئے، پھر قاہرہ یونیورسٹی میں "عرب جغرافیہ" پر اور عین شمس یونیورسٹی میں "عربوں کے ہندوستان پر احسانات" کے موضوع پر مقالات پیش کئے اس کے علاوہ فسطاط میں مسعودی کی قبر تلاش کی اور ان سب مشغولیتوں کے ساتھ وہاں کے قدیم و جدید کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا۔ سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کی طرف سے جب ڈاکٹر محمود الحق میدانی مطالعہ کے لئے ۱۹۶۹ء میں مصر گئے تھے، ان کا بیان ہے کہ وہاں کے مشہور روزگار قدیم

ترین کتبخانہ دارالکتب المصریۃ کے ایک ذمہ دار کو دوہندوستانی علماء کے نام اور وہ جگہ اچھی طرح یاد تھی جہاں وہ جم کر مطالعہ کیا کرتے تھے: ان میں سے ایک مشہور زمانہ عالم عبدالعزیز میمن تھے اور دوسرے ہمارے مقبول صاحب!

مقبول صاحب کی قاہرہ آمد پر راقم کے قیامِ مصر کا آخری سال تھا، محمد راشد(۳۰) صاحب ندوی بہت پہلے مارچ ۱۹۶۲ء میں مصر سے واپس ہوکر ۱۶/نومبر ۱۹۶۲ء کو ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ سے وابستہ ہوچکے تھے، انہیں کے واسطہ سے اس وقت قاہرہ میں مقیم ہندوستانی طلباء کا مقبول صاحب سے غائبانہ تعارف ہوا، ہم سب نے خود اپنی آنکھوں سے قاہرہ میں مقبول صاحب کی دن رات کی علمی سرگرمیوں کا مشاہدہ کیا اور ان سے مل کر ہندوستانی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے خود سر اساتذہ کا مجموعی تأثر زائل ہوا، ہم سب دن بھر کی مشغولیتوں کے بعد رات تاخیر سے بدل بدل کر کسی متعین جگہ پر مقبول صاحب سے ملاقات کرتے، دلبستگی کی بے تکلف مجلس میں وہ اپنے مقام و مرتبہ سے بے نیاز ایک مخلص یو ملنسار دوست اور ہمدرد و مہربان بزرگ انسان کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے، اپنے غیر روایتی افکارو خیالات سے نوازتے، دوسروں کے ملے جلے جذبات و تاثرات خوشدلی سے سنتے، ہر ایک کی تعلیمی سرگرمیوں اور مستقبل کے منصوبوں سے دلچسپی لیتے، یورپ و امریکہ اور ہندوستان میں اعلی تعلیم اور ملازمت کے امکانات پر بحث کرتے اور خیر خواہانہ مشورے دیتے۔

میری خوش قسمتی کہ یہ وقتی تعارف بعد میں ان کی نگرانی میں علی گڑھ میں ریسرچ کی بنیاد بنا، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کی انٹرویو کمیٹی میں ان کی موجودگی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے میرا انتخاب ہوا، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن میں اتفاقاً چند ماہ ساتھ رہا، پھر انہی کے اصرار پر سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز علی گڑھ سے ملازمت کا رشتہ جڑا، اس طرح مصر کی مبارک سرزمین پر عارضی ملاقات دھیرے دھیرے زندگی کی خوشگوار رفاقت میں تبدیل ہوئی۔ میری طرح اور بیشمار خوش

قسمت خدا کے بندے ہیں جن کو اس شجرِ سایہ دار نے اپنی گھنی چھاؤں میں علی گڑھ اور ہندوستان کے دیگر اداروں میں ترقی کی راہ پر گامزن کیا، یقین ہے کہ وہ سب ان کو دعا دیتے ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو اپنے بہترین انعامات سے نوازے۔

لبنان (۷-۱۰/اپریل ۱۹۶۴ء)

یہاں اگرچہ قیام مختصر تھا لیکن وہاں کے معروف علماء و ادباء سے ملاقات ہو گئی اور فرنچ گرلز اسکول میں "عربوں کے ہندوستان پر احسانات" والا مقالہ عربی میں سنایا۔

لبنان کا دوسرا سفر ۱۹۷۰ء میں ہوا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

دمشق (۱۰-۱۱/اپریل ۱۹۶۴ء)

دمشق سے گویا صرف گذر ہوا پھر بھی راستہ میں بعلبک اور رومن آثار قدیمہ دیکھ لئے اور دمشق کی مشہور جامع اموی کی زیارت کرلی۔

عراق (۱۲/اپریل تا ۳/مئی ۱۹۶۴ء)

ڈاکٹر صالح احمد العلی (پروفیسر بغداد یونیورسٹی اور صدر معہد الدراسات الاسلامیہ) کی دعوت پر یہ سفر ہوا۔

دو ہفتہ یونیورسٹی کے مہمان رہے، معہد میں سمینار لئے اور یونیورسٹی میں "مسعودی بحیثیت سیاح اور جغرافیہ نگار" اور "عرب و ہند تعلقات" پر لیکچر ہوئے۔ یونیوسٹی کی میزبانی ختم ہونے کے بعد اپنے دوست جمال قدوائی صاحب کے مہمان ہوئے اور ان کے ساتھ کربلا، کاظمین، ہندیہ بیراج، بغداد میوزیم، مسجد و مقبرہ امام اعظم ابو حنیفہ، اور بابلیون و نینوا کے تاریخی مقامات دیکھے۔ ۲۷/ کو بصرہ کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں قدیم بندرگاہ ابلہ اور تاریخی شہر طیفون، مدائن، زبیر وغیرہ دیکھے۔ پھر

مسعودی کے تتبع میں ۱۳ر مئی کو بصرہ سے بمبئی کے لئے بحری سفر اختیار کیا کہ اس کے بیان کئے ہوئے مقامات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کا موقع ملے۔ راستہ میں شط العرب، خرم شہر، کویت، بحرین، ام سعید (قطر)، ابو ظبی سے گذرتے ہوئے ۱۱ر مئی کو کراچی پہنچے، جہاز منوراپیئر کے باہر رکا اور وہیں ان کی تیسری والدہ اور ان کے بچوں سے ملاقات ہوئی۔ ۱۳ر مئی کو بمبئی میں یہ سفر ختم ہوا۔ عراق کا دوسرا سفر ۱۹۷۳ء میں ہوا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

شمالی افریقہ (۱۷-۲۴ر مئی ۱۹۷۰ء)

مرکزی وزارت تعلیم ہند نے ثقافتی تبادلہ کے تحت ہندوستانی آرٹس، کلچر، تاریخ اور افریقہ کے ساتھ ہندوستان کے قدیم تعلقات پر لیکچر دینے کے لئے مقبول صاحب کا انتخاب کیا، اصلاً یہ سفر تونس، مراکش، الجیریا وغیرہ کا تھا لیکن کسی وجہ سے صرف تونس تک محدود رہا اور واپسی میں بیروت یونیورسٹی کی دعوت پر دوبارہ لبنان جانا ہوا۔

تونس: (۱۷-۲۴ر مئی ۱۹۷۰ء)

اس سفر کی ابتدا انگلینڈ سے ہوئی جہاں وہ ۱۹۵۱ء میں واپسی کے بعد پہلی مرتبہ لندن میں دوست احباب اور Hythe میں ساس سسر سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ ۱۷ر مئی کو تونس پہنچے جہاں تونسی وزارت تعلیم اور ہندوستانی سفارت کے زیر اہتمام مختلف شہروں میں وسیع پیمانے پر علماء و ادباء اور سرکاری عہدیداران و اہل صحافت سے ملاقات ہوئی، تعلیمی ادارے دیکھے اور اکثر جگہ تقریریں اور لیکچر ہوئے۔ تونس یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس میں "عرب و مسلم ممالک سے ہندوستان کے تعلقات" پر لیکچر کے بعد سوال ہوا کہ کیا ہندوستانی مسلمان مذہب کی پیروی میں تونسی بھائیوں سے بہتر ہیں؟ جواب دیا گیا کہ ہندوستان میں شدت پسندی زیادہ ہے اور جدیدیت کا اثر

دھیرے دھیرے ہو رہا ہے۔

وزیر اعظم کے قریبی لوگوں میں مسجد مرسا کے خطیب محمد کمال ترزی سے زائر کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ تونس کی اکثریت مالکی ہونے کے باوجود حنفی مفتی کے فتوے بخوشی تسلیم کرتی ہے(۳۱) ان کو یہ معلوم کر کے مزید اطمینان ہوا کہ حکومت تونس نے عائلی قوانین کے پانچ فیصد معاملات اپنے اختیار میں لے لئے ہیں جیسے زبانی طلاق سرکاری طور پر تسلیم نہیں ہوتی، مجسٹریٹ کے پاس جانا ہوتا ہے، وہ پہلے مصالحت کی کوشش کرتا ہے، اس میں ناکامی کے بعد عدالت طلاق کا حکم صادر کرتی ہے، نیز دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے، اس کے علاوہ وراثت کی تقسیم میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں، جیسے نئے قانون کے تحت تنہا وارث بیٹی جس کا کوئی رشتہ دار زندہ نہ ہو کو سو فیصد ترکہ مل جاتا ہے۔

الجمعیۃ القومیۃ لمحافظۃ القرآن کے جلسہ میں محمود تیجی نے ہندوستان میں عربی اور اسلامیات کی تعلیم کی حیثیت، مسلمانوں کی عام حالت اور بھیونڈی اور جلگاؤں کے فسادات سے متعلق سوالات کئے جن کے مناسب جوابات دیئے گئے۔

جنوبی تونس کے دورہ میں قیروان کے معہد وعظ وارشاد میں "عرب دنیا کے ساتھ ہندوستان کے قدیم اور موجودہ تعلقات" پر تقریر ہوئی، سوسہ اور منستیر بھی گئے، منستیر کے معہد الفقیان میں طلبا اور طالبات کے جلسہ کو خطاب کیا واپسی میں نابل سے بھی گذر ہوا۔

لبنان (۲۴ تا انتہائے مئی ۱۹۷۰ء)

بیروت یونیورسٹی کے مہمان کی حیثیت سے ہفتہ بھر قیام رہا، سفارت ہند کے فرسٹ سکریٹری ڈاکٹر برکات احمد کے ہمراہ قدیم احباب اور دیگر اہل علم و ادب سے ملاقات ہوئی، پروفیسر نقولا زیادۃ کی درخواست پر "ہندوستان میں جدید اسلام اور

مسلمانوں کے مسائل" نیز "ازمنہ وسطیٰ میں جغرافیہ میں عربوں کے اضافے" اور "ہندو عرب ثقافتی تعلقات" پر یونیورسٹی میں لیکچر ہوئے، اس کے علاوہ ان ہی کی خواہش پر "اسلام اور عیسائیت کے درمیان رقابت" کے موضوع پر ایک ایم اے تھیسس جانچا اور اس طالب علم کا وائیوالیا۔

حج: (۱۹۷۲ء)

حکومت ہند کے خیر سگالی وفد حج کے ساتھ حجاز کی مقدس زمین کی زیارت اور ادائے مناسک حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں کے تاریخی مقامات کی زیارت کا بھی اہتمام کیا۔ یہ سفر بڑے ذوق و شوق اور والہانہ جذبہ کے ساتھ ہوا تھا، اس جذبہ کی راکھ میں دبی ہوئی آگ کو مشتعل کرنے میں ان کے رفیقِ کار سہ ماہی ثقافۃ الھند نئی دہلی کے نائب مدیر صدرالدین عامر صاحب انصاری کا بڑا ہاتھ تھا، اس مبارک موقع پر وہی ان کو دہلی کی بزرگ ہستیوں میں سے شیخ تبلیغ مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی اور ان کے رفقائے کار سے ملاقات کے لئے مرکز تبلیغ بنگلہ والی مسجد لے گئے تھے۔ واپسی پر اس مبارک سفر کے خوشگوار اثرات بھی کچھ عرصہ تک دیکھے اور سنے جاتے رہے۔ واپسی پر علی گڑھ میں پہلے جمعہ کی باجماعت نماز سرسید ہال کی مسجد میں راقم اور احمد اشفاق صاحب کے ساتھ ادا کی تھی اور اس کے لئے گھر سے تیار ہو کر آئے تھے۔ ایک عرصہ بعد غالباً ۱۹۷۶ء میں میری انگلینڈ سے واپسی کے بعد نیو کیمپس جواہر لال یونیورسٹی میں میرے مکان پر مقیم تھے، میری خوشدامن پردے کے پیچھے سے ان پر تبلیغ کر رہی تھیں اور ہم لوگ چھیڑ چھاڑ میں حصہ لے رہے تھے، مقبول صاحب نے اپنا دفاع کرتے ہوئے صبح سویرے اٹھنے کی عادت کا ذکر کیا اور بے خیالی میں نماز فجر سے پہلے کبھی کبھار تہجد کا ذکر کر گئے، پھر حاضرین کو ایک دینی تقریر سے بھی مستفید کیا جس میں اخلاق و معاملات پر زور تھا۔ غالباً مطلب یہ تھا کہ قاضی کا بیٹا حاضر ملاؤں سے کسی میدان میں کم نہیں ہے! میرا خیال تھا کہ وہ سادہ مزاج

نیک طینت عام انسانوں کی طرح اردگرد کے اچھے برے ماحول سے بہت جلد اثر قبول کرتے ہیں اور اسی کے مطابق نفس کے پوشیدہ خزف ریزے اور جوہر کھلنے لگتے ہیں۔

اس سفر میں مقبول صاحب کو جلالۃ الملک فیصل بن عبدالعزیز شہید سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا، مقبول صاحب نے اپنی کتاب Indo-Arab Relations ان کی خدمت میں پیش کی جسم میں "وہابی تحریک" کا ذکر بھی تھا، شاہ مرحوم نے اس نام کی تصحیح "نجدی تحریک" سے کی جس کو مقبول صاحب نے خوشدلی سے تسلیم کیا، اسی سیاق میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> "مملکت سعودیہ پہلا ملک ہے جہاں شیخ نجدی کے بتائے ہوئے راستہ پر عمل شروع ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے، قبر پرستی کا تو سختی سے خاتمہ کر دیا گیا، فقہ میں اختلاف رائے بھی آہستہ آہستہ دور کیا جا رہا ہے اور تلفیق کے اصول کو استعمال کر کے نئی فقہ کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے (؟) بعض مسائل میں اجتہاد بھی جاری ہے، مثلاً اسی زمانے میں مفتی مدینہ سے مسجد نبوی میں ملنے کا موقع ملا، میں نے ان سے زکوٰۃ کے بارے میں سوال کیا کہ حکومت اس پر کس طرح عمل کرتی ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ ہماری رائے میں ہر وہ اسلامی حکومت جو مالی لحاظ سے ضرورت مند ہو زکوٰۃ وصول کرنے کی حقدار ہوتی ہے؟ لیکن مملکت سعودیہ چونکہ خود دولتمند ہے اس لئے اسے سرکاری طور پر زکوٰۃ وصول کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ حکومت اس بات کی ضرور خبر رکھتی ہے کہ ہر شخص زکوٰۃ دیتا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی کوتاہی کرتا ہے تو اس سے باز پرس کی جاتی ہے، لیکن یہ زکوٰۃ عوام ہی جمع کرتے ہیں اور اپنے اپنے علاقوں کے ضرورت مند لوگوں پر صرف کرتے ہیں۔

شیخ نجدی کی اصلاحی تحریک کا اثر نہ صرف سعودی حکومت پر پڑا بلکہ دنیائے اسلام کے کئی ملک اور قومیں اس سے متاثر ہوئیں۔ اگر اس تحریک کا

بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ تحریک ایک مذہبی اجتہاد تھا لیکن اس کا اثر مسلمانوں کے ثقافتی یا تعلیمی مسائل پر نہ ہونے کے برابر تھا۔ تعلیم کے وہ مسائل بالکل نہیں چھیڑے گئے جو مثلاً بعد کے زمانہ میں مفتی محمد عبدہ نے مصر میں اور سر سید احمد خاں نے ہندوستان میں اٹھائے تھے، غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ تک اسلامی دنیا مغرب کے علمی اور سائنسی انقلاب سے واقف نہ تھی، اور اگر تھی تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔"(۳۲)

عراق کا دوسرا سفر (۲۳ر مارچ۔ ۱۳ر اپریل ۱۹۷۳ء)

عراقی سوسائٹی آف ہسٹری اینڈ ارکیالوجی کی عالمی کانفرنس منعقدہ بغداد ۲۵-۳۰ر مارچ ۱۹۷۳ء میں شرکت کے لئے یہ سفر منجانب انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ نئی دہلی ہوا، پروفیسر محمد شفیع اگوانی (۳۳) ہمراہ تھے اور آمد و رفت براہِ کویت ہوئی تھی۔ کانفرنس کے آخری جلسہ مخصوص برائے مسئلہ فلسطین میں مقبول صاحب کا مقالہ پیش ہوا۔

اس سفر میں ڈاکٹر ابراہیم شوکت نے ادریسی کا وہ عالمی نقشہ ہدیہ کیا جس کو المجمع العلمی العراقی نے Max Muller کے نقشوں کی بنیاد پر تصحیح کے ساتھ شائع کیا تھا۔

کانفرنس کے اختتام کے بعد پروفیسر اگوانی کے ساتھ شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار پر حاضری دی اور ایک بار پھر مسجد و مقبرہ امام اعظم ابو حنیفہ، کربلائے معلّیٰ اور مدائن وغیرہ کی زیارت کی۔

افغانستان (۱۴۔ ۲۳ر جون ۱۹۷۳ء)

یہ سفر برائے شرکت جشن البیرونی منعقدہ کابل ۱۶-۲۱ر جون ۱۹۷۳ء منجانب

انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نئی دہلی ہوا۔ اس سفر میں کابل یونیورسٹی اور کابل میوزیم وغیرہ کے علاوہ غزنین میں سلطان محمود سوم کا محل، البیرونی لائبریری، محمود غزنوی، شاہ یلغار، شاعر سنائی کے مزارات پر حاضری دی اور بیرونی کے مقبرہ کی تلاش میں اس باغ تک پہنچے جہاں کہا جاتا ہے کہ وہ مدفون تھے لیکن رہبر نے جس قبر کے پتھر کی نشاندہی کی اس پر زائر کو یقین نہ آیا۔

فرانس، انگلینڈ اور اٹلی: (جولائی- ستمبر ۱۹۷۳ء)

فرانس (۱۴ر جولائی ۱۹۷۳ء)

یو جی سی نئی دہلی نے مقبول صاحب کو انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹس پیرس کے اجلاس ۱۹۷۳ء میں شرکت کے لئے ڈیلیگیٹ مقرر کیا تھا، اس سفر میں ان کے ہمراہ پروفیسر عبدالعلیم اور پروفیسر مونس رضا (۳۴) وغیرہ تھے۔ اس سفر میں مقبول صاحب نے ایک مقالہ بعنوان Growth and Decay of Islamic Science in the Middle Ages پیش کیا۔

اس سے پہلے ایام طالب علمی میں مقبول صاحب نے پروفیسر گب کی ہدایت پر اسی کانگریس کے اجلاس ۱۹۴۸ء میں انگلینڈ سے پیرس جاکر شرکت کی تھی۔ اسی سفر میں پہلی بار ان کی ملاقات حلب (شام) کے پروفیسر احمد یوسف الحسن سے ہوئی جو بعد میں یونیسکو کے پروجیکٹ Aspects of Islamic Culture کی چوتھی جلد Science in Islam کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور مقبول صاحب اس کے Co-Editor بنے۔

انگلینڈ:

کانگریس کے اختتام پر مقبول صاحب اپنے اہل و عیال سے ملاقات کے لئے لندن چلے گئے اور ایام تعلیم کی یاد تازہ کرنے لگے، اگست میں بیگم اور بچیوں کے ساتھ

لیک ڈسٹرکٹ کی تفریح کے لئے طویل سفر کیا، پھر ۲۴/اگست کو اپنے مادر علمی آکسفورڈ گئے جہاں ایک معزز اولڈ بوائے کی حیثیت سے ان کا استقبال ہوا، ستمبر میں کیمبرج بھی گئے جہاں اس وقت علی گڑھ کے سید اطہر حسین رضوی اور ان کی بیگم انور اسماعیل برائے ریسرچ و تحقیق مقیم تھے۔

اٹلی (۹ ستمبر ۱۹۷۳ء)

انگلینڈ کے اس قیام کے دوران ہی Jesuit Society روم کی دعوت پر اٹلی کا دوسرا سفر کیا، پہلا سفر ایام تعلیم میں ۱۹۴۸ء میں ہندوستانی اعزہ سے ملاقات کے ارادے سے اٹلی تک کیا تھا، لیکن راستہ میں نروس بریک ڈاؤن ہو جانے کی وجہ سے اٹلی سے واپس لندن چلے گئے تھے۔ بہر حال اس سفر ۱۹۷۳ء میں روم سے ویٹیکن (Vatican) بھی گئے اور اس کی مشہور لائبریری Vaticana Biblioteca میں چند مخطوطات کا مطالعہ کیا اور وہیں نصیر الدین طوسی کی کتاب التذکرۃ فی الھیئۃ سے اقتباسات لئے۔ روم کے Institute Italiano per 11 Medioed Estremo Oriente (ISMEO) گئے جہاں سے شریف ادریسی کی کتاب نزھۃ المشتاق فی اختراق الآفاق کا مکمل ایڈیشن شائع ہوا تھا اور اس میں مقبول صاحب کا مرتبہ حصہ بھی شامل تھا۔ پھر روم سے نیپلز (Naples) ہوتے ہوئے لندن واپسی ہوئی اور وہاں سے ہندوستان۔

انگلینڈ اور مغربی یورپ (۱۹۷۵ء)

طالب علمی کے زمانہ میں یورپ کے بیشتر ممالک خاص کر مشرقی یورپ کا سفر مقبول صاحب کر چکے تھے، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن کی فیلوشپ (۷۴-۱۹۷۶ء) کے دوران ۱۹۷۵ء کے وسط میں اہل و عیال کے ساتھ خشکی کے راستہ سے ہالینڈ، بلجیم، جرمنی وغیرہ تفریح کے لئے جانے کا پھر موقع ملا، اور ڈیڑھ دو ماہ کے بعد لندن واپس ہوئے۔

ترکی (۱۰/اکتوبر ۱۹۷۶ء)

یو جی سی کی طرف سے ترک تاریخی کانگریس انقرہ کے اجلاس ہشتم منعقدہ ۱۱-۱۵/اکتوبر ۱۹۷۶ء میں شرکت کے لئے ڈاکٹر محمد صادق (۳۵) کے ہمراہ مقبول صاحب کا یہ سفر ہوا، خلافت تحریک پر مقبول صاحب نے اپنا مقالہ جس جلسہ میں پیش کیا اس کی صدارت ڈاکٹر عفت عنان نے کی جو کمال اتاترک کے ساتھیوں میں تھیں، پھر ان کی رفاقت تاریخی مقامات کی زیارت میں بھی نصیب ہوئی۔ کانگریس کے اختتام کے بعد صادق صاحب کے بعض احباب کے ہاں چند دن قیام رہا۔

انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ (اگست ۱۹۷۷ء)

پندرھویں انٹرنیشنل کانگریس آف ہسٹری آف سائنس منعقدہ اڈنبرا ۱۰-۱۹/ اگست ۱۹۷۷ء میں یو جی سی نئی دہلی کی طرف سے ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کا موقع ملا جس میں مقبول صاحب نے خوارزمی پر ایک مقالہ پیش کیا۔ بیگم اور بچیوں سے ملاقات کی غرض سے کانگریس سے پہلے مقبول صاحب لندن پہنچ گئے تھے اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ قیام کیا۔

ملیشیا

اس سفر کی تاریخ اگرچہ معلوم نہ ہو سکی لیکن مقبول صاحب نے اپنی غیر مطبوعہ "آپ بیتی" میں اس کا تذکرہ ہندوستان میں ۱۹۷۷ء کے جنرل الیکشن کے بعد کیا ہے، مقصد بڑی بیٹی زہرہ اور پوتی زرینہ سے ملاقات تھی جن سے ملے عرصہ گذر چکا تھا، بیگم بھی اسی غرض سے اس زمانہ میں انگلینڈ سے کوالالمپور پہنچ گئی تھیں جہاں زہرہ ملازمت کرتی تھیں۔

عرب جہازراں اور سیاح جزیرہ نمائے ملایا کے مغربی ساحل پر ایک مشہور

بندرگاہ کلہ یا کلاہ (Kalah) کا ذکر کرتے ہیں، جہاں بحر بنگال سے عرب جہاز سیدھے آتے تھے اور پھر یہاں سے چین روانہ ہوتے تھے، یہ مقام اب اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے، اس کی تلاش میں مقبول صاحب زہرہ کے ایک دوست راجہ بیرسٹر کے ہمراہ بذریعہ کار کیدا (Kedah) کے لئے روانہ ہوئے اور قدیم بندرگاہ کلاہ بار کے بارے میں پوچھتے پوچھتے تقریباً اس جگہ پہنچے جہاں وہ پہلے آباد تھا، لیکن وہاں ان کو اس کے کوئی آثار نہیں ملے۔

سوویت یونین (۱۱-۲۶/اگست ۱۹۷۹ء)

انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ، نئی دہلی کے مقبول صاحب ممبر تھے، اس کا ایک وفد رجنی کوٹھاری کی سربراہی میں Indo-Soviet Joint Commission for Co-Operation in Social Sciences کے اجلاس منعقدہ ماسکو ۱۸-۲۰/اگست ۱۹۷۹ء میں شرکت کے لئے جانے والا تھا، مقبول صاحب اس وفد کے بھی رکن منتخب ہوئے تھے اس لئے انہوں نے اس کے اجلاس میں شرکت کی اور باہمی تعاون کے مسائل پر غور وخوض میں حصہ لیا، پھر وفد کے ساتھ اہم تاریخی مقامات کے دورہ کا بھی موقع ملا۔

سنٹرل ایشیا (۱۷/مارچ-۱۰/اپریل ۱۹۸۴ء)

مقبول صاحب کے قیام کشمیر کے دوران Tajik Academy of Science اور Centre of Central Asian Studies سرینگر کے درمیان ایک ثقافتی تبادلہ کا معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت مذکورہ اکیڈمی نے مقبول صاحب کو تاجکستان اور ازبکستان کے دورے اور لیکچر دینے کی دعوت دی، لندن سے بیگم بھی ہمراہ سفر ہوئیں، اس سفر میں وہ دونوں موسکو کے راستہ سے دوشنبہ، سمرقند، بخارا، تاشقند وغیرہ گئے۔

دوشنبہ، تاجکستان (۱۹-۲۴ر مارچ ۱۹۸۳ء)

۱۹ر مارچ کو موسکو دوشنبہ پہنچے تو جشنِ نوروز کا ہنگامہ برپا تھا، اس ضمن میں انسٹی ٹیوٹ آف اگری کلچر اور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے پروگراموں میں شرکت کی، مقبول صاحب نے فارسی میں اور ان کی بیگم نے روسی زبان میں تقریریں کیں۔ اس کے بعد وہاں کے کئی مشہور عجائب گھر، انقلابی لیڈر صدرالدین عینی کا مجسمہ، مسجد اور مقبرہ یعقوب چرخی، انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ہسٹری وغیرہ دیکھے اور ان کے ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ فردوس لائبریری کی نادر کتابوں میں نصیرالدین طوسی کی تصنیف اصول الحساب کا بھی مطالعہ کیا، دوشنبہ سے باہر ایک قدیم قلعہ اور مدرسہ بھی دیکھنے گئے۔ ۲۲ر مارچ کو اورینٹل انسٹی ٹیوٹ اور تاجکستان یونیورسٹی کی فیکلٹی آف ایسٹرن لنگویجز کے جلسہ میں "کشمیر، ہندوستان اور تاجکستان کے قدیم تعلقات" پر عربی، فارسی اور اردو میں تقریر کی، شام کو پروفیسر عاصموف کے دولتکدہ پر کمال الدین عینی، پروفیسر مختاروف، عبداللہ جان غفاروف وغیرہ کی موجودگی میں تاجک اکیڈمی اور سنٹرل ایشین اسٹڈیز سرینگر کے درمیان تعاون کے طریقوں پر غور و خوض ہوا اور تجاویز پاس ہوئیں۔

سمرقند، ازبکستان (۲۴-۲۶ر مارچ ۱۹۸۳ء)

سمرقند کے سہ روزہ قیام میں بہت سے قدیم مدارس و مساجد، مقابر و خانقاہیں اور عجائب گھر و قلعے دیکھے جن میں قابل ذکر گورمیر (مزار تیمورلنگ)، شاہ زندہ (ترک و تیموری شاہزادوں کا قبرستان)، شاہ ترکستان و ماوراء النہر الغ بیگ بن شاہ رخ (۱۳۹۳-۱۴۴۹ء) کی برباد شدہ رصدگاہ اور مدرسہ کی زیارت کی، موجودہ صدی کی ابتدا میں اس رصدگاہ کی دریافت نو ہوئی تھی۔

بخارا (۲۷-۳۰/مارچ ۱۹۸۳ء)

بخارا کے چار روزہ قیام میں وہاں کے قدیم تاریخی مقامات دیکھے اور عوام و خواص سے ملاقاتیں ہوئیں۔

تاشقند (۳۱/مارچ-۲/اپریل ۱۹۸۳ء)

تاشقند میں وہاں کے تاریخی مقامات کے علاوہ لینن اسکوائر بھی گئے جہاں ہندو پاک کے درمیان ۱۹۶۶ء میں مشہور معاہدہ تاشقند ہوا تھا۔ وہاں کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز (قائم شدہ ۱۹۴۳ء) میں اس کے اساتذہ سے بھی ملاقات ہوئی۔

دوشنبہ (۲-۵/اپریل ۱۹۸۳ء)

اس دورہ کی تکمیل کے بعد دوشنبہ واپسی ہوئی تو بیگم مقبول صاحب لندن کے لئے ۳/اپریل کو ماسکو روانہ ہو گئیں۔ ۴/اپریل کو پروفیسر عاصموف کے ساتھ پہلے کی متفقہ تجاویز کی روشنی میں ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔

ماسکو (۵-۱۰/اپریل ۱۹۸۳ء)

معاہدہ کے بعد مقبول صاحب ماسکو کے لئے روانہ ہوئے جہاں پانچ روز قیام رہا، بعض احباب سے ملاقاتیں ہوئیں، ان میں علی گڑھ کی زیدی بہنوں (ساجدہ، زاہدہ کی بہن) میں سے شاہدہ رنجیت (ملازم ماسکو ریڈیو) بھی تھیں جن کے گھر کھانے کی دعوت بھی ہوئی اور ۱۰/اپریل کو مقبول صاحب ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے۔

ایران

۱۹۸۵ء کے آخر میں مرتب کردہ ایک Bio-Data میں مقبول صاحب کے سفر ایران کا نام بھی ملتا ہے لیکن اس سفر کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔

جاپان

اسی طرح غیر مطبوعہ "آپ بیتی" میں مغربی یورپ کے سفر کے سیاق میں جنگ عظیم دوم کی تباہی کے بعد جرمنی اور جاپان کی ترقی اور خوشحالی کے بیان میں ضمناً سفر جاپان کا حوالہ بھی ملتا ہے، لکھا ہے:

"اور جاپان حال (۱۹۹۱ء) ہی میں گیا تھا، دونوں ملکوں کی اس وقت کی تباہی اور حال کی خوش حالی قابلِ مثال ہے۔"

"آپ بیتی" میں الگ سے سفر جاپان کا تذکرہ اس لئے نہیں ملتا کہ اس میں صرف اگست ۱۹۹۱ء تک کے حالات مذکور ہیں، بعد کے حالات قید تحریر میں نہ آسکے۔ بحر حال یہ نہ مقبول صاحب کے اسفار کی مکمل فہرست ہے، نہ تمام اسفار کی تفصیلات کا ہی پورا علم ہے، ان سرخیوں سے صرف ان کا ایک اندازہ ہی ہو سکتا ہے۔

فصل چہارم

سیاست میں حصہ

مقبول صاحب کی تعلیم کا زمانہ جنگ آزادیٔ ہند کے عروج کا دور تھا، اس جہاد آزادی میں بزرگوں کے دوش بدوش بلکہ پیش پیش طلبا بھی ہوتے تھے، بمبئی میں مقبول صاحب کے والد اور برار میں چچا حکیم سید محی الدین کا تحریک خلافت اور اس کے رہنماؤں سے گہرا ربط ضبط تھا، بلکہ ۱۹۲۰ء میں تو ان کے چچا اسی تحریک عدم تعاون کے ضمن میں جیل بھی گئے تھے، خود مقبول صاحب جب ۱۹۳۷ء میں چھٹی کلاس میں تھے تو انہوں نے خلافت تحریک کے ایک جلسۂ عام میں مسئلۂ فلسطین پر پانچ منٹ کی پہلی تقریر کی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک داؤدی بوہرہ طالب علم اکبر علی صاحب (وفات ۱۹۹۱ء) سے دوستی ہوئی تو سیاسی مسائل پر گفتگو ہونے لگی اور حصول آزادی کے لئے ایک ''وطن پارٹی'' بناڈالی، ان کے اردو کے ایک استاد Mr. A. B. Khan کو ان دونوں کی سیاسی دلچسپی کا اندازہ ہوا تو ان کی خاطر مدارات کے بعد چند نوجوانوں کو جمع کرنے کا مشورہ دیا، تاکہ جب ضرورت پڑے تو انگریز افسران کو گولی سے اڑایا جائے، سترہ اٹھارہ برس کے یہ نوجوان یہ بات سن کر ایسے حواس باختہ ہوئے کہ پھر خان صاحب کے گھر کبھی نہ گئے اور کالج کا زمانہ شروع ہونے کے بعد وطن پارٹی کی طرف بھی توجہ نہ دے سکے۔

بہر حال مقبول صاحب ۱۹۳۸ء میں کالج میں داخل ہوئے تو سارا ملک سامراج سے آزادی کے حصول کے لئے متحد تھا، اگرچہ انگریزوں کی چالبازیوں اور اہل وطن کے درمیان آپس میں رواداری اور عاقبت اندیشی کے فقدان کی وجہ سے ہندو مسلم منافرت روز افزوں تھی، اسی ماحول میں ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو تقسیم ہند کا مطالبہ سامنے آیا، کرپس مشن ناکام ہوا، ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو گوالیا رٹینک (موجودہ کرانتی میدان) بمبئی

میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت کانگریس کا تاریخی جلسہ منعقد ہوا، جس میں انگریزوں سے "ہندوستان چھوڑو" کا مطالبہ کیا گیا، مقبول صاحب اپنے ایک نیشنلسٹ دوست زبیری صاحب کے ساتھ جلسہ میں شریک تھے، دوسرے دن ۹/اگست کو بھی جلسہ ہونا تھا، اس دن پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا آزاد، مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو وغیرہ رہنما راتوں رات گرفتار ہو چکے ہیں، مجمع مشتعل تھا، آنسو گیس چھوڑی گئی، فائرنگ کی وارننگ صادر ہوئی تو اگرچہ مجمع منتشر ہوا لیکن Quit India Movement نے زور پکڑ لیا۔ مقبول صاحب اپنے قوم پرست دوستوں کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے مسلم لیگی طلبا کا نشانہ بننے لگے۔

اعلی تعلیم کے لئے انگلینڈ پہنچے تو پہلے ۱۹/فروری ۱۹۴۵ء ہی کو "انڈین لیگ، لندن" کے کرتا دھرتا کرشنا مینن صاحب سے ملاقات کی، اور ان کے ساتھ مل جل کر ملک کی آزادی کے لئے بدیس میں کام کیا، اس وقت سے مینن صاحب کے آخری وقت تک ان دونوں کے درمیان قریبی تعلقات قائم رہے۔

ہندوستانی طلبا کی انجمن "آکسفورڈ مجلس" مسز اندرا گاندھی کی صدارت کے بعد سے بے جان پڑی تھی، مقبول صاحب پہنچے تو اس زمانہ میں اس کا احیاء ہوا اور وہ اس کے صدر منتخب ہوئے۔

جنگ عظیم دوم کے خاتمہ کے بعد ۱۹۴۵ء میں انگلینڈ میں نئے الیکشن ہوئے، مقبول صاحب نے لیبر پارٹی کی حمایت اس لئے کی کہ وہ آزادئ ہند کی حامی تھی۔

خود مقبول صاحب کے بقول والد صاحب کی تربیت اور اولیاء و صوفیاء کی عقیدت سے خدمت خلق، عوام کی حمایت اور حکومت کے مظالم کے خلاف جو مزاج بنا تھا شاید اسی کی وجہ سے انگلینڈ میں "برٹش کمیونسٹ پارٹی" کا ممبر بنا، پھر آزادئ ہند کے بعد انگلستان میں ہندوستانی کمیونسٹوں کو جب ملک میں برژوا طبقہ کے اقتدار پر قبضے کی وجہ سے متوقع عوامی انقلاب کے برپا ہونے سے مایوسی ہوئی تو مہپت سین نے اپنے رفقاء جن

میں مقبول صاحب بھی شامل تھے کے ساتھ انگلینڈ میں "ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی" قائم کی، اس کے علاوہ سوویت یونین کی زیر سرپرستی مشرقی یورپ میں کمیونزم کی اشاعت کے لئے پراگ (چیکوسلواکیہ) میں منعقد ہونے والے یوتھ فیسٹول ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۹ء، اور بوڈاپسٹ (ہنگری) میں ۱۹۴۸ء میں منعقدہ ورلڈ اسٹوڈنٹ فیڈریشن، پھر ۱۹۵۰ء میں پیرس میں منعقدہ وارساپیس کانگریس کے جلسوں میں ہمراہ منیب الرحمٰن صاحب شریک ہوئے، غالباً انہی وابستگیوں اور سرگرمیوں کا خمیازہ تھا کہ ۱۹۵۱ء میں ہندوستان واپسی کے وقت کرشنا مینن (ہندوستانی ہائی کمشنر متعینہ برطانیہ) کی سفارش کے باوجود آزاد خور مختار قومی حکومت کی عنایت سے پاسپورٹ ضبط ہوا، واپسی کے لئے صرف Single Journey Permit ملا، لندن میں اہل و عیال سے ملاقات کے لئے سفر کی کوئی سبیل نہ رہی! پھر کرشنا مینن (ہندوستانی نمائندہ اقوام متحدہ، نیویارک) ہی کی مساعی سے ۱۹۵۴ء میں جب دوبارہ پاسپورٹ ملا تو فوری ضرورت رفع ہو چکی تھی، اس لئے کہ اس زمانہ کے آس پاس خود اہل و عیال ہندوستان پہنچ گئے تھے۔

دلچسپ بات یہ کہ ان کے نگرانِ کار پروفیسر گب صاحب کو ابتدا ہی میں جب مقبول صاحب کی یاسی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ ہوا تو انہوں نے ان کو تنبیہ کی اور اچھے اسکالر بننے کے لئے ان کو علم و تحقیق کی طرف متوجہ کیا تھا لیکن

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

کا مضمون تھا!

اس پس منظر میں ہندوستان واپسی پر مقبول صاحب ۱۵/اگست ۱۹۵۱ء کو علی گڑھ آئے، یہاں پہلے ہی ترقی پسندی اور روشن خیالی کے نام پر گویا آزاد خیال کمیونسٹ گروہ کا راج تھا، ایک عرصہ تک اس گروہ سے وابستہ اساتذہ کی سرگرمیوں میں مقبول صاحب بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، ایک بار کارل مارکس کی برسی پر جلسہ اور جلوس کا پروگرام بنایا، ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر کو تشویش ہوئی تو پروفیسر محمد حبیب صاحب

کے ساتھ انہوں نے افہام و تفہیم کی تب صرف جلسہ ہوااور جلوس منسوخ ہوا۔ مقبول صاحب نے پروفیسر محمد حبیب صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات کے دوران اس واقعہ کوان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اس زمانہ میں علی گڑھ میں ترقی پسندی کا دور تھا، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ جب ہم کارل مارکس کی برسی منانے جارہے تھے، یہ طے ہوا کہ جلسہ ہوگا پھر جلوس نکالا جائے گا، میں اس زمانہ میں علیم صاحب کے گھر ہی میں رہتا تھا، دیکھا کہ ذاکر صاحب اور حبیب صاحب میرے کمرے میں آئے، مجھے تعجب ہوا! حبیب صاحب نے کہا کہ دیکھئے جلسہ کرنا تو ٹھیک ہے لیکن جلوس نکالنا مناسب نہیں، اس پر ذاکر صاحب نے کہا کہ یہ صحیح ہے، جلسہ آپ کرلیں لیکن جلوس نکالنا مناسب نہیں اس لئے کہ پھر آپ یونیورسٹی کے اختیار سے باہر ہو جائیں گے اور ضلع حکام کی زد میں آجائیں گے، پھر ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ میں سمجھ گیااور کہا کہ آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا، چنانچہ ہم نے جلسہ تو کیا لیکن جلوس نہیں نکالا۔"

پھر ملک میں کمیونسٹ تحریک کے درمیان اختلافات رونما ہوئے، انتشار بڑھا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تو یونیورسٹی کا حلقہ یاراں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، آپس کی رنجشیں ور قابتیں اور شکایتیں حکایتیں اس کے سوا تھیں، آخر کار مقبول صاحب کی اس تحریک سے وابستگی کم ہوتے ہوتے گویا بے تعلقی ہوگئی، خواہ خیالات میں تبدیلی نہ ہوئی ہو۔

حیرت کی بات ہے کہ بہت سے مسلم دانشورانِ ہند کی طرح مقبول صاحب بھی بایں ہمہ علم و آگہی اور روشن خیالی دین و مذہب کے نام پر مسلم معاشرہ میں مروّجہ خرافاتی رسوم و رواج کے قائل معلوم ہوتے تھے، ان کے مخالفین کو "وہابی" تصور کرتے تھے اور ہم جیسے رفقاء سے گفتگو میں بے تکلفی سے کہا کرتے تھے کہ تم لوگوں کا اسلام روکھا سوکھا اور بے رنگ و بے کیف ہے! اس کے علاوہ دوسری حیرت انگیز بات یہ

ہے کہ نہ صرف ہندوپاک بلکہ پورے عالم اسلام میں مغربی آراء و افکار کے مبلّغ ہمارے یہ مسلم دانشور اپنی قوم و ملّت کی موت و زیست کے اہم مسائل اور اس کی تمناؤں اور آرزؤں سے ایسے بیگانہ رہتے ہیں جیسے کہ ان کا کبھی اپنے معاشرہ سے تعلق نہ رہا ہو! یہی وجہ ہے کہ ان کی کسی جزوی اصلاحی معقول بات پر بھی قوم کان دھرنے کو آمادہ نہیں ہوتی۔ مسلم معاشرہ کے لئے ان کے نامانوس افکار و خیالات کو صرف طاقت کے بل بوتہ پر مسلّط کرنے کا موقعہ وہیں ملتا ہے جہاں جمہوریت کے اس نام نہاد دور میں مطلق العنان مستبد حکمرانوں کی سرپرستی ان کو حاصل ہو جاتی ہے، پھر بھی اپنے معاشرہ میں نکّو بنے رہنے کا عقدہ (Complex) ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا اور اس کا مظاہرہ اپنے مخالف ذہن و مزاج رکھنے والوں سے حقد و حسد اور سب و شتم کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مقبول صاحب کم از کم اپنے اظہار مدّعا کے باب میں کافی محتاط رہنے کی کوشش کرتے تھے اور دینی ذہن رکھنے والے طلبا و رفقاء کے ساتھ کوئی فرق نہ کرتے تھے!

حواشی

۱۔ پروفیسر عبدالعلیم صاحب (۱۵/اگست ۱۹۰۶- ۱۸/فروری ۱۹۷۶ء) کی صدارت، شعبہ عربی کے موجودہ Display Board پر ۵۶(؟)-۱۹۶۸ء لکھی گئی ہے بعد میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر (جنوری ۱۹۶۸ء- جنوری ۱۹۷۴ء) رہے، اس کے بعد ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی کے تاوفات چیرمین رہے، دہلی میں وفات ہوئی اور علی گڑھ میں دفن ہوئے۔ ان پر ایک مجموعہ مقالات مرتبہ پروفیسر محمد سالم قدوائی بعنوان "علیم صاحب" ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ سے شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ محمد شفیع صاحب بعد میں S.D.C. ہو گئے تھے، پندرہ سال (۱۹/اگست ۱۹۶۸ء تا ۱۸/اگست

۱۹۸۳ء) سنٹر سے وابستہ رہے اور پوری جانفشانی سے اس کی ترقی میں حصہ لیا، پھر سکشن افسر ہو کر کسی دوسرے شعبہ میں منتقل ہو کر ۳۰/اگست ۱۹۸۵ء کو ریٹائر ہوئے۔ زمانہ دراز سے ہومیوپیتھی کی کامیاب پریکٹس ہے اور اپنے علاقہ میں ڈاکٹر مشہور ہیں۔

۳۔ عبدالملک خاں صاحب بحیثیت Peon سنٹر سے وابستہ رہے، ۳۰/جون ۱۹۸۲ء کو ریٹائر ہوئے اور ۲۰/مارچ ۱۹۹۲ء کو انتقال کیا۔

۴۔ سید احمد اشفاق صاحب (ولادت ۱۶/اپریل ۱۹۴۰ء) ۲۶/نومبر ۱۹۷۵ء سے چھٹی لے کر Reference Librarian (King Fahd) University of Petroleum and Mineral, Dhahran کی حیثیت سے وابستہ ہوئے، وقت پر یونیورسٹی واپس نہ آسکے، ظہران ہی میں Head of Reference اور Systems Librarian کے عہدوں پر ترقی پاتے رہے، پھر ۱۱/نومبر ۱۹۸۲ء سے سلطان قابوس یونیورسٹی، الخوض، مسقط، سلطنت عمان کے لائبریرین ہیں۔

۵۔ پروفیسر سید نورالحسن صاحب (وفات جولائی ۱۹۹۲ء) نواب رامپور کے داماد، انگلینڈ میں مقبول صاحب کے زمانہ تحقیق کے ہمعصر دوست، علی گڑھ کے شعبہ عربی میں ان کو بلانے کے محرک تھے۔ ان کی صدارت شعبہ کے دوران ۱۹۶۸ء میں علی گڑھ کے شعبہ تاریخ کو Centre of Advanced Study کا رتبہ حاصل ہوا۔ اندرا گاندھی کی وزارت عظمیٰ کے دوران ۱۹۷۱ء میں وزیر تعلیم ہوئے، روس میں ہندوستان کے سفیر متعین ہوئے، Council for Scientific and Industrial Research, New Delhi کے نائب صدر رہے، عرصہ سے بنگال کے گورنر تھے، اسی عہدہ پر کلکتہ میں وفات ہوئی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں دفن ہوئے۔

۶۔ ڈاکٹر مشیرالحق صاحب ۱۹۷۶ء میں اسلامیات کے پروفیسر ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی منتقل ہوئے، وہاں سے ۱۹۸۷ء میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر سرینگر گئے جہاں ۱۰/اپریل ۱۹۹۰ء کو ان کی مظلومانہ شہادت ہوئی اور جامعہ میں دفن ہوئے۔ کافی عرصہ بعد سنٹر میں ان کی جگہ پر ڈاکٹر شاہ عبدالقیوم صاحب کی تقرری ۲/اپریل ۱۹۸۱ء کو ہوئی، یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو وفات سے پہلے اسی جگہ پر ترقی پاکر پروفیسر ہو گئے تھے،

افسوس کہ ترقی کا پروانہ ان کی وفات کے بعد صادر ہوا۔ ۱۰/مارچ ۱۹۹۳ء سے اس جگہ پر ڈاکٹر شمیر حسن کام کر رہے ہیں۔

۷۔ مسعود الرحمٰن آٹھ سال بعد اسی پوسٹ پر ترقی پاکر پروفیسر ہوئے، ۸/اگست تا ۹/ستمبر ۱۹۸۷ء اور ۱۹/اگست ۱۹۹۱ء تا ۳۰/جون ۱۹۹۳ء صدر شعبہ رہے۔

۸۔ عارف صاحب کی خالی کی ہوئی فیلوشپ پر ڈاکٹر محمد اقبال متعین ہوئے، آئندہ منصوبہ میں اقبال صاحب معاشیات کی نئی لیکچرر شپ پر منتخب ہوئے اور عارف صاحب اپنی ہی پوسٹ پر ریڈر ہوئے۔

۹۔ عسکری صاحب بھی اپنی پوسٹ پر ترقی پاکر ریڈر ہوئے، محمد نسیم فاروقی صاحب کی وائس چانسلری (۱۵/اکتوبر ۱۹۹۰- ۱۵/دسمبر ۱۹۹۴ء) کے ہنگامہ خیز دور میں عین ان کی پروفیسر شپ کی ترقی کی سلیکشن کمیٹی کے وقت وائس چانسلر کا گھیراؤ کرا کے کمیٹی ملتوی کرادی گئی تو تاریٹائرمنٹ ۱۳/دسمبر ۱۹۹۶ء ان کی ترقی کی کمیٹی نہ ہو سکی، البتہ وہ ۱۵/اگست تا ۱۳/دسمبر ۱۹۹۶ء صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

۱۰۔ مس کتیمہ کی ضخیم کتاب مقبول صاحب کی زیر نگرانی تیار ہو گئی تھی جس میں کافی عمارتی نقشے اور اسکیچ وغیرہ شامل تھے، اس کی اشاعت کے بارے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں ہے۔ انہوں نے سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کی عمارت کا ایک خوبصورت نقشہ بھی تیار کیا تھا جس کے بیرونی رخ میں گلاس ورک کا بہت سلیقہ اور فیاضی سے استعمال دکھایا گیا تھا، لیکن مالی کفایت کے بہانے اسی فیاضی سے بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ نے ان کے نقشہ میں قطع وبرید کی، اس کے بعد اس عمارت کی جو شکل نکلی وہ ہمارے سامنے ہے۔ فیلوشپ ختم ہونے کے بعد وہ تھائی لینڈ چلی گئیں، ان کے دو عزیز عمران ملولم اور جیران ملولم بھی سنٹر کے طالبعلم رہے ہیں۔

۱۱۔ علیم اللہ صاحب ۶/دسمبر ۱۹۸۵ء سے Documentation officer کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

۱۲۔ مسرور قریشی صاحب ایک زمانہ ہوا مولانا آزاد لائبریری منتقل ہو گئے تھے۔

۱۳۔ سلیم صاحب نے دوبار ۴/مئی ۱۹۷۹ء تا ۷/اگست ۱۹۸۴ء اور ۱۰/ستمبر ۱۹۸۷ء تا

ریٹائرمنٹ ۱۰راپریل ۱۹۸۹ء صدارت شعبہ کی ذمہ داری انجام دی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پروفیسر رشید الدین خان صاحب کے ساتھ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، پھر Centre for Federal Studies جامعہ ہمدرد، نئی دہلی سے منسلک رہے۔اس مدت میں ان کی ایک نئی کتاب Early Muslim Perception of India and Hindustan شائع ہو چکی ہے، (South Asia Publisher, New Delhi, 1997; pp.330) دوسری کتاب Al-Beruni's Discovery of India تیار ہے اور Muslim Backwardness in India in the context of World History پر کام کے لئے کمر بستہ ہیں۔

ان کی خالی کی ہوئی ریڈر شپ پر بڑی مدت کے بعد ڈاکٹر محمد گلریز ادر پروفیسر شپ پر ڈاکٹر اختر مجید ۱۰راپریل ۱۹۹۱ء کو متعین ہوئے۔اختر مجید صاحب نے بھی دوبار یکم جولائی ۱۹۹۳ء تا ۳۰ر جون ۱۹۹۶ء اور یکم جولائی ۱۹۹۶ء تا ۱۴راگست ۱۹۹۶ء صدارت شعبہ کا بار اٹھایا۔ پھر رخصت پر U.P Higher Education Commission کے ممبر کی حیثیت سے الٰہ آباد میں رہے اور اب یکم اپریل ۱۹۹۹ء سے Centre For Federal Studies جامعہ ہمدرد، نئی دہلی میں پروفیسر و صدر اور ڈین فیکلٹی ہیں۔

۱۴۔ محمود صاحب نے بھی دوبار ۸راگست ۱۹۸۴ء تا ۷راگست ۱۹۸۷ء اور ۱۲راپریل ۱۹۸۹ء تا ریٹائرمنٹ ۱۸راگست ۱۹۹۱ء صدارت کی، فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے ۷رجولائی ۱۹۸۹ء تا ۳رجولائی ۱۹۹۱ء ڈین رہے اور تین سال ۱۹راگست ۱۹۹۱ء تا ۱۸راگست ۱۹۹۴ء Re-employment بھی لیا۔

ان کی خالی کی ہوئی عام پروفیسر شپ پر ڈاکٹر ناظم علی ۱۲رجنوری ۱۹۹۸ء منتخب ہوئے جن کے پاس ۱۴ردسمبر ۱۹۹۶ء سے صدارت شعبہ کا چارج بھی ہے۔

۱۵۔ اس منصوبہ کی آسامیوں پر درج ذیل اشخاص مقرر ہوئے:

☆ ڈاکٹر ناظم علی صاحب، ریڈر معاشیات از ۱۳رمارچ ۱۹۸۶ء، پھر ۱۲رجنوری ۱۹۹۸ء کو پروفیسر متعین ہوئے، صدارت شعبہ ۱۴ردسمبر ۱۹۹۶ء سے انہی کے ذمہ ہے۔

☆ ڈاکٹر علی محمد صاحب، ریڈر جغرافیہ از ۵رفروری ۱۹۸۵ء تا ۱۵رفروری ۱۹۹۴ء، پھر

شعبہ جغرافیہ میں بحیثیت پروفیسر منتقل ہوئے۔

☆ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب، لیکچرر معاشیات، از یکم اپریل ۱۹۸۴ء، پھر ۱۲/ جنوری ۱۹۹۸ء سے وہ اپنی ہی پوسٹ پر ریڈر ہوئے۔

☆ محمد اکرم خاں صاحب شروانی، لیکچرر سماجیات از ۱۰/ مارچ ۱۹۸۶ء، پھر ۱۲/ جنوری ۱۹۹۸ء کو وہ شعبہ سماجیات میں ریڈر ہو کر وہیں منتقل ہو گئے۔

☆ ڈاکٹر غلام مرسلین صاحب، لیکچرر عربی، از ۱۰/ مارچ ۱۹۸۶ء ، پھر ۱۲/ جنوری ۱۹۹۸ء کو اپنی پوسٹ پر ترقی پا کر ریڈر ہوئے۔

☆ محمد توصیف صاحب، کارٹوگرافر از ۳۱/ مارچ ۱۹۸۴ء

☆ مصاحب علی صاحب، LDC / ٹائپسٹ، از ۸/ اگست ۱۹۸۴ء تا ۸/ ستمبر ۱۹۹۴ء، پھر ٹیچر منتخب ہو کر سیف الدین طاہر ہائی اسکول، مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہوئے۔

☆ پہلے کی دو فیلوشپس تبدیلی اور اضافہ کے بعد کل تین ریسرچ اسوسی ایٹ شپس ہو گئیں، اسی طرح سابق تین جونیر ریسرچ فیلوشپ (JRF) بڑھ کر آٹھ ہو گئیں۔

● ساتویں پنجسالہ منصوبہ (۸۵-۱۹۹۰ء) میں صرف دو عام لیکچرر شپ کا اضافہ ہوا جن پر درج ذیل رفقا، ۱۰/ مارچ ۱۹۹۳ء کو منتخب ہوئے:-

☆ جغرافیہ کے ڈاکٹر فضل محمود صاحب

☆ پولٹیکل سائنس کے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب

☆ تین ریسرچ اسوسی ایٹ شپس اور آٹھ JRF حسب سابق برقرار رہیں۔

● آٹھواں پنجسالہ منصوبہ (۹۲-۱۹۹۷ء) اس لحاظ سے بہت مایوس کن رہا کہ سنٹر کی کارکردگی سے اطمینان کے باوجود UGC نے اس سے اپنا دست شفقت اٹھالیا، عذر لنگ یہ تھا کہ سنٹر یونیورسٹی کا ایک باقاعدہ ترقی یافتہ شعبہ بن چکا ہے اس لئے اب اس کی تمام ضروریات دیگر شعبوں کی طرح یونیورسٹی سے پوری ہونی چاہئیں اور خود UGC کی عام اسکیموں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ حیرت ہے کہ UGC کو مسلم یونیورسٹی ترمیم شدہ ایکٹ ۱۹۷۲ء کے بموجب سنٹر کے یونیورسٹی کا ایک شعبہ بننے کا علم تقریباً بیس سال بعد ہوا؟ اصلاً Area Studies کے تحت سنٹر کے ساتھ خصوصی مراعات کا معاملہ ایک تو اس

وجہ سے تھا کہ یہ کام کی ابتدا تھی، دوسرے اس کام کی نوعیت اور تقاضے دیگر شعبوں سے جدا تھے، اب اگر اس کے اختیار کے فیلو شپس، اسکالر شپس نیز فیلڈ ٹرپس، خرید کتب و جرائد، سنٹر کی تیار کردہ کتابوں اور رسالہ کی اشاعت وغیرہ تمام مالیاتی ذمہ داریوں سے یکلخت سبکدوشی اختیار کر کے ان کو صرف یونیورسٹی کے حوالہ کر دیا جائے تو وہ اس مالی بحران کے زمانے میں ان کو کیسے پورا کر سکے گی؟ یونیورسٹی کا دامن خود تنگ ہے اور سوے زیادہ مختلف النوع شعبوں اور دیگر اداروں کے تقاضے اس کو پورا کرنا ہیں۔ شاید UGC نے یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا، اسلئے کمیٹی میں بحث و مباحثہ سے کوئی فائدہ نہ ہوا، اعتراف کارگردگی کے باوجود UGC official اپنی بات دہراتے رہے۔ ابتک سینٹر کے لئے یو جی سی سے Review Com. علیحدہ آتی تھی، اب یونیورسٹی کے عام شعبوں کے ساتھ اس کے مطالبات پر غور کیا کریگی۔

- نویں منصوبہ کے لئے ۵/اپریل ۱۹۹۷ء کو یونیورسٹی کے مطالبات پر غور کرنے کے لئے کمیٹی آچکی ہے اور بظاہر سنٹر کی کارکردگی سے مطمئن ہوئی تھی، لیکن ابتک رپورٹ کا انتظار ہے۔

۱۶۔ شعبہ اسلامیات کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ منیب صاحب یکم نومبر ۱۹۷۰ء کو تین سال کی چھٹی لے کر ملازمت کے لئے امریکہ گئے تھے، پھر وہیں کے ہو رہے۔

۱۷۔ نظامی صاحب (۲۵/دسمبر ۱۹۲۵-۵/دسمبر ۱۹۹۷ء) پروفیسر شعبہ تاریخ تھے، پروفیسر نورالحسن کے بعد عرصہ دراز تک صدر شعبہ رہے، پروفیسر عبدالعلیم صاحب کے بعد ۳/جنوری تا ۳۰/اگست ۱۹۷۴ء ایکٹنگ وائس چانسلر کی حیثیت سے کام کیا، پھر سوریا کے سفیر ہو کر دمشق چلے گئے۔ واپسی کے بعد ۳/جولائی ۱۹۷۷ء تا ۳۰/جولائی ۱۹۸۰ء ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنس رہے اور ۲۴/دسمبر ۱۹۸۵ء کو ریٹائر ہوئے۔ ان کا شاندار ذاتی کتب خانہ اور بیش قیمت ذخیرہ دستاویزات کسی بڑے صاحب ذوق اسکالر ہی کو نصیب ہو سکتا ہے۔ آخر وقت تک لکھنے پڑھنے کا معمول برقرار رہا اور اعلیٰ معیار پر ان کی تصنیفات شائع ہوتی رہیں۔

۱۸۔ غالباً یہ تجویز پروفیسر سید اطہر حسین رضوی صاحب کی تھی، بہر حال وہ، تعارف ان کی نگرانی

میں دہلی میں چھپا تھا۔ افسوس کہ ۹ر جون ۱۹۹۵ء کو اچانک اطہر بھائی کی وفات ہو گئی۔ وفات کے وقت وہ شعبہ میکانیکل انجینیرنگ کے صدر تھے۔

۱۹۔ ساجد کا تعارف باب اول، حاشیہ نمبر ۲۹ میں گذر چکا ہے۔

۲۰۔ ایک فریق کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ مقبول صاحب کا تجزیہ غیر جانبدارنہ ہونا مشکل تھا، علی گڑھ میں گروہ بندی کی حقیقت کا ذکر خوش قسمتی سے خود ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے دو خطوط میں ملتا ہے، پہلا خط مورخہ ۶ر جنوری ۱۹۶۰ء کرنل سید بشیر حسین صاحب زیدی کے نام ہے، اس میں علی گڑھ کی خود پسند مطلب پرست ذہنیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "جن مسئلوں کا ذکر آپ نے کیا ہے ان میں اگر ذاتیات کا دخل نہ ہو تو فیصلے مشکل نہ ہوں، مگر علی گڑھ میں تو اور علی گڑھ ہی کیا ہمارے ملک میں تو ہر مسئلہ "ذاتیات" کا مسئلہ ہے، پھر ذاتیں بھی موٹی ذاتیں ہیں کہ ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ ایک دو باتیں نہیں سب کچھ ویسا ہی ہو جیسا کہ اس کے خیال میں اس کے اور اس کے دوستوں کے لیے پسندیدہ ہے، پھر "کامیابی" پر بھوک اور بڑھ جاتی ہے اور قصہ ختم ہونے میں نہیں آتا تا آنکہ "شکست" ہو، پیہم شکست! اور اس سے دوسروں کو کامیابی کا گھمنڈ پیدا ہو اور سر پر چڑھے تا آنکہ انہیں شکست ہو!
>
> ادارہ اس کامیابی اور شکست کے چکر میں خراب ہوتا ہے، کوئی کامیابی والا اگر کامیابی کے دور دورہ میں دوسروں کو بھی کامیاب ہونے دے تو اپنی شکست کی نوبت بھی دیر میں آئے، لیکن یہ کون کرے؟ اور کون کسے سمجھائے؟ (پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، شہید جستجو، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء صفحات ۴۱۲-۴۱۳)

دوسرا خط مورخہ ۲۰ر جون ۱۹۶۰ء ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے نام ہے، اس میں وضاحت سے برسر پیکار دونوں گروہوں کو علی گڑھ کو برباد کرنے کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"میرے ذہن میں تو ایک نقشہ جم گیا ہے، وہ یہ کہ علی گڑھ دو ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے، اور دونوں ادارے کی تباہی کے درپے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ دونوں کامیاب ہوں گے! کہیں پڑھ رہا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے قرآن کی یہ آیت پڑھی کہ وقالت الیھود لیست النصاری علی شی وقالت النصاری لیست الیھود علی شی تو آپ نے فرمایا: صدقنا۔

علی گڑھ کی ٹکڑیوں سے متعلق میرا بھی یہی خیال ہے:

الف کہتا ہے کہ ب علی گڑھ کو تباہ کردے گا۔

ب کہتا ہے کہ الف تباہ کردے گا۔

میں کہتا ہوں: آپ دونوں سچ فرماتے ہیں!

(حوالہ بالا صفحات ۴۱۴-۴۱۵)

دونوں گروہوں کی مخاصمت اور ایک دوسرے سے بیزاری اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے:

"مشہور ہے کہ ایک بار دونوں گروہوں نے الگ الگ ذاکر صاحب کے پاس خفیہ فہرستیں بھیجیں: ایک میں فرقہ پرست اسٹاف کے نام تھے، اور دوسری طرف کمیونسٹ کے، دونوں میں یہ اصرار کیا گیا تھا کہ انہیں یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔

ذاکر صاحب نے انہیں دیکھا اور کہا کہ اگر ان دونوں فہرستوں کے مطابق عمل کیا جائے تو ایک آدمی بھی یونیورسٹی اسٹاف میں نہ رہ جائے گا۔"

(حوالہ بالا، صفحہ ۴۲۳)

تقریباً نصف صدی کے اندر صورت حال بد سے بدترین ہوتی گئی، ذاتی مفادات کے حصول کے لئے نام نہاد نظریاتی واسطہ کا پردہ تار تار ہو چکا، اب ملکی جمہوری روایات کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے عارضی گروہ وقتی مفادات کے لئے ڈھٹائی سے بنتے ہیں اور انتظامیہ سے معمولی رنجش و مایوسی پر یا محض حسد و رقابت کے جذبات کی تسکین

کے لئے پوری کی پوری یونیورسٹی کو دلیری سی یرغمال بنالیتے ہیں، صد حیف کہ اس دھاندلی کی کوئی دہائی نہیں!

۲۱۔ مختار الدین صاحب صدر شعبہ (۶۸۔۱۹۸۴ء)، ڈین فیکلٹی آف آرٹس (۷۶۔۱۹۷۸ء) رہے۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۸۴ء کو ریٹائر ہوے۔ اپریل ۱۹۹۸ء سے مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی، پٹنہ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

۲۲۔ منیب الرحمٰن صاحب ۱۹۶۸-۳۱ر اکتوبر ۱۹۷۰ء تک صدر شعبہ رہے، پھر امریکہ تشریف لے گئے۔

۲۳۔ ریٹائرمنٹ کے بعد عرصہ ہوا ابراہیم صاحب کی وفات ہو چکی۔

۲۴۔ مولانا عبدالعزیز صاحب میمن ۳۶۔۱۹۵۰ء صدر شعبہ عربی تھے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان گئے، وہاں شعبہ عربی کراچی یونیورسٹی (۵۶۔۱۹۵۹ء) اور پنجاب یونیورسٹی، لاہور (۶۰-۱۹۶۶ء) سے وابستہ رہے، ۱۷ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو وفات ہوئی۔

۲۵۔ اس حصہ میں قدیم جرائد ورسائل کا ذخیرہ اس وقت سے ابتک ہے۔

۲۶۔ مقبول صاحب کے کمرہ میں آجکل ڈاکٹر سبط حسن (اسلامیات)، اس سے ملحق چھوٹے کمرہ میں ڈاکٹر سفیان اصلاحی (عربی) اور دفتر کے محمد شفیع صاحب کے کمرہ میں ڈاکٹر سید احسن (اسلامیات) فروکش ہیں۔

۲۷۔ شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

۲۸۔ شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

۲۹۔ عباس ہمدانی، مقبول صاحب کے بمبئی کے زمانہ تعلیم کے استاد ڈاکٹر حسین ہمدانی کے صاحبزادے، امریکن یونیورسٹی، قاہرہ میں اس وقت پروفیسر تھے۔

۳۰۔ راشد صاحب اسلامیات سے مئی ۱۹۷۷ء میں بحیثیت ریڈر شعبہ عربی منتقل ہوئے، وہیں پروفیسر منتخب ہوئے اور ۸۴-۱۹۸۷ء، ۸۸-۱۹۹۱ء، ۹۴-۱۹۹۶ء تین بار صدر شعبہ رہے۔

۳۱۔ غیر مطبوعہ "آپ بیتی" کے علاوہ ایک اور مطبوعہ کتابچہ میں مقبول صاحب نے تونس کے حوالہ سے عرب ممالک میں اس روادارانہ عوامی رجحان کا پسندیدگی کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس باب میں ہندوستان کی اصلاحی تحریکوں کی ناکامی پر بے اطمینانی کا اظہار کیا

ہے۔(اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد خاں کا مرتبہ ،مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۱، صفحہ ۱۹)

۳۲۔ ایضاً صفحہ ۱۷۔۱۸

۳۳۔اگوانی صاحب جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے مدت دراز تک صدر تھے، پھر باری باری اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے ڈین، یونیورسٹی کے ریکٹر اور وائس چانسلر ہوئے،اس کے بعد مرکزی اقلیتی کمیشن کے ممبر رہے۔

۳۴۔ جغرافیہ کے مطالعہ میں Inter-Disciplinary رجحان کے مائک مونس صاحب (۲۵-۱۹۹۴ء) علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور ۱۹۵۰ء سے اس کے شعبہ جغرافیہ کے سرگرم عمل ممتاز استاد تھے، ۱۹۵۷ء میں Co-ordinator کی حیثیت سے یونیورسٹی کا نیا شعبہ جنرل ایجوکیشن سنٹر قائم کیا، ریجنل انجینیرنگ کالج، سرینگر میں Humanities کے پروفیسر اور کالج کے پرنسپل رہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے جغرافیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ (۶۹-۱۹۸۰ء) ہوئے تو اپنے مخصوص رجحان کے مطابق اسٹڈی آف ریجنل ڈولپمنٹ سنٹر قائم کیا اور یونیورسٹی کے ریکٹر (PVC) کی حیثیت سے اس کے قیام اور ترقی میں بھرپور حصہ لیا، ۱۹۸۰ء میں نیشنل انسٹیٹوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ آخر میں ملک کی سب سے بڑی دانشگاہ دہلی یونیورسٹی کے فعال اور موثر وائس چانسلر رہے۔

۳۵۔ ڈاکٹر صادق علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور یہاں کے شعبہ اسلامیات میں لیکچرر تھے، اعلیٰ تعلیم ترکی میں مکمل کی اور ترکی زبان وادب اور تاریخ کے اکلوتے ہندوستانی ماہر ہیں، غالباً ۱۹۷۲ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز میں ریڈر ہو کر گئے، وہیں پروفیسر ہوئے اور کئی بار صدر شعبہ رہے، ڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز بھی ہوئے۔Re-employment اسکیم کے تحت ابھی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

باب سوم

تحقیقی اور تصنیفی تحریروں کا جائزہ

فصل اول

مطبوعات

مقبول صاحب کی تحریروں کی فہرست غیر مرتب اور ادھوری ہے، جب بھی ضرورت پڑتی، عجلت میں تاریخ یا موضوعات کے لحاظ کے بغیر ایک فہرست تیار ہو جاتی، تقریباً ربع صدی قبل احمد اشفاق صاحب (ڈاکومینٹیشن افسر، ویسٹ ایشین اسٹڈیز لائبریری) نے ایک فہرست تیار کر کے شائع کی تھی، فی الوقت اس کا نسخہ دستیاب نہیں، بعد کی دو فہرستیں ملیں: اول سائیکلواسٹائل میں ۱۹۸۵ء تک کے کاموں کا تذکرہ ہے، دوسری ٹائپ شدہ میں ۱۹۹۱ء تک کی بعض تحریروں کا ذکر ہے، لیکن ان کی تصحیح نہیں ہوئی ہے اور ان میں کچھ اختلافات بھی ہیں۔ بہر حال اس زیر ترتیب فہرست میں انہی دونوں کو بنیاد بنایا گیا اور علیگڑھ میں دستیاب حوالوں سے ان کی تصدیق کی گئی، پھر بھی ایک قابل لحاظ تعداد ایسی بچ رہی جس کی تصدیق نہ ہو سکی، دونوں قدیم فہرستوں میں کہیں کہیں اشاعت کی تفصیلات نامکمل اور صفحات کا بالکل تذکرہ نہ تھا، اب بھی جہاں کہیں یہ خامی دکھے تو یہی سمجھا جائے کہ حوالہ علی گڑھ میں دستیاب نہ ہو سکا۔ نیز زیر ترتیب فہرست کو ہم نے پہلے مقبول صاحب کے تین خصوصی موضوعات: اسلامی جغرافیہ، بین الاقوامی تعلقات، تاریخ علوم وفنون اور متفرقات کے تحت تقسیم کر کے ان کے ذیلی عنوانات بھی قائم کئے ہیں اور ذیلی عنوان کے ماتحت ہی متعلقہ کتب اور مقالات کو جمع کر دیا ہے۔ مسلسل نمبر کے پہلے B کتاب کی اور A مقالہ کی علامت ہے۔ مسلسل نمبر کے بعد اضافی عدد اس کتاب یا مقالہ کے ترجمہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

اسلامی جغرافیہ

یہ موضوع تحقیقی زندگی کی ابتدا سے تصنیفی و تالیفی زندگی کی انتہا تک مقبول صاحب پر حاوی رہا، بلکہ شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ دیگر موضوعات پر بھی انہوں نے جو قلم اٹھایا تو ان کی بیشتر غذا ان کو اپنے اصلی موضوع کے مواد ہی سے ملتی رہی۔ اسلامی جغرافیہ میں اتنی ناموری اور شہرت حاصل کرلی تھی کہ گذشتہ بیس پچیس برسوں میں اس پر دنیا کے بیشتر کام کرنے والوں کا حوالہ و مرجع بن گئے تھے، اکثر منصوبوں میں ان سے صلاح و مشورہ کیا جاتا تھا اور تمام معروف و مشہور Encyclopaedias کی طرف سے قدیم مسلم جغرافیہ نگاروں اور تاریخی مقامات وغیرہ پر مقالات کی خصوصی فرمائشوں کی قطار لگی رہتی تھی، جس کی وجہ سے ان کو بیکاری اور زندگی سے بیزاری کا کبھی احساس نہیں ہوا، اطمینان قلب کی عظیم نعمت کے ساتھ ہمہ وقت کام میں مشغول رہتے اور بڑھاپے میں جوانی کے مزے لوٹتے رہتے اور شاید یہ مصرعہ دہراتے رہے ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

المسعودی: علی بن حسین (وفات ۳۴۶ھ/۹۵۷ء)

B-1. Al Mas`udi's contribution to Medieval Geography. Quarterly *Islamic Culture*, Hyderabad, 27/2, April 1953; pp.61-77. 28/1, January 1954; pp.275-286. 28/4, October 1954; pp.509-524

مقبول صاحب نے ۱۹۴۵ء میں اپنی علمی زندگی کی ابتدا اس کام سے کی تھی، اس کے لئے انہوں نے مسعودی کی معروف تاریخی کتاب مروج الذہب و معادن الجوہر کے جغرافیائی مباحث کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور اس کے مصادر و مراجع کا تحلیلی جائزہ اور

تنقیدی تجزیہ کیااوران کی قدر و قیمت متعین کی،اسی پر ۱۹۴۷ء میں ان کو B.Litt. کی ڈگری ملی اور چھ سال بعد مذکورہ بالا رسالہ میں قسط وار شائع ہوا اور علمی حلقوں میں ان کے تعارف کاذریعہ بنا۔

اردو ترجمہ: B -1.1.

مسعودی بحیثیت جغرافیہ نگار از پروفیسر انور معظم، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحات ۱۶۴۔ اصل کام کی اشاعت کے تقریباً ربع صدی بعد مقبول صاحب کے دوست پروفیسر انور معظم نے مذکورہ کتاب کااردو ترجمہ تیار کر کے اس کو اہتمام سے کتابی شکل میں شائع کیا تو اردو داں طبقہ کو بھی اس سے واقفیت ہوئی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں خود مقبول صاحب نے اس کا تعارف اور اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مشہور عرب مورخ ابوالحسن علی بن الحسین مسعودی پر میں نے ۱۹۴۵ء میں اکسفورڈ یونیورسٹی میں سر ہملٹن گب کے مشورہ سے تحقیقی کام شروع کیا تھا، چنانچہ ابتداء میں اس کی مشہور تصنیف مروج الذھب و معادن الجوھر کی پہلی چار جلدوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اس کے بعد ضروری معلوم ہوا کہ اس کے جغرافیائی تصورات اور سیاحت کے حالات نیز دیگر متعلقہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے، اس لئے کہ اس کی علمی و تحقیقی زندگی کا یہی وہ اہم پہلو ہے جس سے اس کی معلومات اور نظریات کی نشاندہی ہوتی ہے اور جس کے بعد اس کا علمی و فکری مقام بہت ارفع و اعلیٰ نظر آتا ہے۔

چنانچہ زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس نے نہ صرف عرب بلکہ یونان، روم، ہند نیز دیگر قدیم اور متمدن اقوام کے فلسفیوں، ہیئت دانوں، دانشوروں، مورخوں، اور سیاحوں کی کتابوں کا

گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا جن کے حوالے اس کی تصانیف میں مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔ غرضکہ اس تحقیقی کام میں تقریباً ڈھائی سال صرف کرنے کے بعد میں نے اپنی یہ کوشش اکسفورڈ یونیوسٹی کی بی۔لٹ (بیچلر آف لٹریچر) کے لئے پیش کر کے ۱۹۴۷ء میں ڈگری حاصل کی۔ یہ دور میری علمی زندگی کا ابتدائی دور تھا جس میں میں نے سرگب اور ڈاکٹر جوزف شاخت سے استفادہ کیا اور تحقیق کے طریقے سیکھے۔

۱۹۵۳ء میں جب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ملازمت کے دو سال گذار چکا تھا، میرا یہ کام اسلامک کلچر، حیدر آباد میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔ کام کی اہمیت کے پیش نظر میرے چند دوستوں کی رائے ہوئی کہ یہ کام اردو میں بھی شائع ہونا چاہئیے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ میرے ساتھی اور دوست ڈاکٹر انور معظم (۱) نے انجام دیا اور اس پر قیصر امروہوی (۲) صاحب نے نظر ثانی کی۔ میں ان دونوں حضرات کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے بڑی محنت اور توجہ سے اس کا ترجمہ کیا اور اب یہ کام اہل نظر کے سامنے ہے۔ میں قاضی معزالدین احمد صاحب کا بھی بیحد ممنون ہوں کہ موصوف نے اپنے جذبۂ علم دوستی کے تحت آزاد کتاب گھر کی اشاعتوں میں اسے جگہ دی۔"

اس کتاب کی ابتدا میں روایتی حالات زندگی کے بیان کے بجائے مسعودی کی علمی شخصیت کا براہ راست تعارف کرایا گیا ہے، پھر کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پہلے حصہ کے تین ابواب میں مسعودی کی تحریروں کے مآخذ پر بحث کی گئی ہے، جن میں یونانی اور عرب فلاسفہ و مفکرین، علمائے ہئیت و جغرافیہ کے بیان کے بعد کتب تاریخ، روایات اور مقبول عام تصورات، شعر و شاعری، طبی و جغرافیائی اثرات سے اپنے موضوع کا مواد حاصل کیا گیا ہے۔

دوسرے، حصہ کے دو ابواب میں مسعودی کی ہندو سندھ، بحر زنج، خراسان وبجستان، کرمان وفارس، قومس وجرجان، بحر اخضر وطبرستان، جبال (میدیا) وخوزستان، عراق وجزیرہ، آذربائیجان وشام، بحر میت وبحیرۂ روم، یمن، حضر موت وشحر، بحیرۂ احمر ومصر کی سیاحتوں وتجربات اور معاصر اہل علم وقلم تاجروں وملاحوں جیسے ابوزید حسن سیرانی سے شخصی روابط ومیل جول سے حاصل شدہ معلومات کے ماخذ کا تذکرہ کیا ہے۔

اختتامیہ کے بعد انگریزی زبان میں مقبول صاحب کے مطبوعہ تین مقالات کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے جن کے عنوانات یہ ہیں: ہندی راجاؤں پر مسعودی کے بیانات، معاصر حکمراں، مسعودی کی کتاب عجائب الدنیا کا نسخۂ علی گڑھ۔

B-2. Al-Mas'udi Millenary Commemoration Volume, Calcutta, 1960; pp.xii + 146.

مسعودی کی وفات (۳۴۶ھ/۹۵۷ء) پر ایک ہزار سال گذرنے کے بعد ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ اور Indian Society for the History of Science, New Delhi. کے تعاون سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۸-۱۹/ جنوری ۱۹۵۸ء کو عالمی پیمانہ پر شایان شان جشن منایا گیا تھا، مقبول صاحب نہ صرف اس کے نظم ونسق کے ذمہ دار تھے بلکہ انہوں نے اس کانفرنس کی کاروائی اور مقالات پر مشتمل یادگار مجلد عبدالرحمٰن صاحب کے اشتراک سے ترتیب دے کر بلند معیار سے شائع کی، یہ وہی کتاب ہے۔

مسعودی پر مقبول صاحب کے مقالات کی فہرست درج ذیل ہے:

A-1. An Introduction to al-Mas'udi (Monograph)
Al-Mas'udi Millenary Celebrations, Aligarh, 1958

مذکورہ جشن کے لئے مسعودی پر تعارفی کتابچہ شائع ہوا تھا جو فی الوقت دستیاب نہ ہو سکا۔

A-2. Al-Mas'udi on the Kings of India. In: B-2. pp.97-112.

A-2.1. اردو ترجمہ:

ہندی راجاؤں پر مسعودی کے بیانات۔ ملاحظہ کریں B.1.1.، صفحات ۱۱۸-۱۳۷

A-3. Balhara: The Rashtrakuta.

Encyclopaedia of Islam, E.J.Brill, Leiden, Holland, New Edition, Vol.I. 1960; p.991.

A-3.2. اردو ترجمہ:

جنوب ہند دکن کے راشٹر کوٹ حکمرانوں (۷۵۳۔۹۷۵ء) پر یہ ترجمہ بعنوان البلہرائے B-1.1 میں مطبوعہ مقالہ "معاصر حکمران" کی ابتدا میں ملاحظہ ہو صفحات ۱۳۸۔۱۴۴

A-4. Al-DJurz. الجرز/الجزر

In: *Encyclopaedia of Islam*, New Edition, (?)

اردو ترجمہ:

A-4.3.

قنوج کا بادشاہ بٹورہ: الجرز یا الجزر، ملاحظہ ہو B.1. 1 میں مطبوعہ مقالہ "معاصر حکمراں" صفحات ۱۴۵۔۱۴۸

A-5. مسعودی کی عجائب الدنیا کا نسخہ علی گڑھ۔

مجلہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ ۱/۱، جون، ۱۹۶۰ء صفحات ۱۰۲۔۱۱۰ اور B-1.1. صفحات ۱۵۳۔۱۶۴

A-6. ابوالحسن المسعودی

ثقافة الهند، نئی دہلی ۱۸/ ۲، اپریل ۱۹۶۷ء صفحات ۳۰۔۴۰

یہ لیکچر Geographical Society، قاہرہ، مصر میں ۱۹۶۴ء کو دیا گیا تھا۔

A-7 Al Mas'udi's Travels in India.

Al-Arab, New Delhi, 7/5 May 1968, pp.10-11 & 15

یہ مقالہ B.1. سے ماخوذ ہو سکتا ہے، جس کا اردو ترجمہ B.1.1. میں دیکھا جا سکتا ہے، صفحات ۷۹۔۱۰۶

A-8. Al-Mas'udi,

In: *Dictionary of Scientific Biography*, New York, Vol.IX.

1974; pp.171-172.

A-9. (مسعودی کے) معاصر حکمراں

B-1.1. صفحات ۱۳۸۔۱۵۲

الادریسی: الشریف محمد بن محمد (۴۹۳۔۵۶۰ھ/۱۱۰۰۔۱۱۶۵ء)

B-3. وصف الهندومابجاور ها من البلاد

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء، صفحات ۸۴+۲۶

مقبول صاحب کے D.Phil (Doctor of Philosophy) کا کام ادریسی کی کتاب نزهة المشتاق فی اختراق الآ فاق کے ہندوستان سے متعلق حصوں کی تحقیق و ترتیب تھا، انہوں نے اس کے متعلقہ متن کی تحقیق کی، ہندوستان کے بارے میں اس کے بیانات کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اس کے وضاحتی نوٹ لکھے، ہندوستان واپسی پر شاید اس کام کو بڑھا کر پڑوسی ممالک: پاکستان، بنگلہ دیش، سیلون (موجودہ سری لنکا) وغیرہ تک پھیلایا اور ۱۹۵۴ء میں پہلے صرف اس کے عربی متن کی اشاعت کی باری آئی۔

اردو ترجمہ:

B-3.2. ہندوستان عربوں کی نظر میں

شائع کردہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، جلد دوم، ۱۹۶۲ء، صفحات ۱۳۰۔۲۳۲

اس کتاب کے دونوں حصے مترجم کے نام کے بغیر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئے لیکن ناظم شعبۂ علمی وڈائرکٹر شعبۂ تاریخ دارالمصنفین شاہ معین الدین صاحب ندوی نے دونوں جلدوں کے دیباچوں میں مرتب و مترجم اور ان کے ساتھ شریک کار اشخاص کی نشاندہی وضاحت سے کردی ہے، یہاں جلد دوم کے دیباچہ کی عبارت نقل کی جاتی ہے:

"اس حصہ کی تالیف اور اس کا ترجمہ بھی پہلے حصہ کے مترجم مولوی ضیاءالدین صاحب اصلاحی، رفیق دارالمصنفین نے کیا ہے اور اس کی اصلاح و ترمیم میں نے کی ہے۔ مترجم نے جابجا ضروری حواشی اور تشریحات بھی تحریر کردی ہیں جس سے متن کے اجمال اور بہت سے پرانے اسماء واعلام کی وضاحت اور تشریح ہو جاتی ہے۔"

قاضی رشید (بن زبیر مصنف کتاب الذخائر والتحف، تالیف تقریباً ۴۶۲ھ/۱۰۷۰ء) اور شریف ادریسی کے بیانات کا ترجمہ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی نے کیا ہے۔"

پھر ادریسی کے تعارف کے خاتمہ پر مقبول صاحب کی تیار کردہ عربی متن کو اردو ترجمہ کی بنیاد بنانے کی صراحت کرتے ہوئے اس کی تعریف بھی کی ہے:

"نزھة المشتاق کا مکمل نسخہ اب تک کہیں چھپا نہیں ہے، اس کے مختلف اجزاء مختلف جگہوں میں چھپتے رہے ہیں۔ ہندوستان سے متعلق جو حصہ ہے اسے ڈاکٹر مقبول احمد صاحب نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنی تحقیق کا موضوع بنایا تھا، چنانچہ انہوں نے بڑی محنت سے اسے ایڈٹ کیا، اس پر انگریزی میں ایک مقدمہ لکھا اور اس کا انڈکس تیار کیا ہے، جسے حال ہی میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات نے وصف الھند ومایجاورھا من البلاد کے نام سے شائع کیا ہے، اسی مجموعہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔" (جلد دوم، صفحہ ۱۲۹)

B.4. India and the Neighbouring Territories. E.J.Brill, Leiden, Holland, 1960;pp.XII+182

ادریسی پر مذکورہ کام B-3. کا باقی حصہ یعنی انگریزی ترجمہ اور وضاحتی حواشی اس کتاب میں ہیں اور کتاب پروفیسر جوزیف شاخت کی تجویز پر بلا معاوضہ لائڈن

یونیورسٹی کو طباعت کے لئے دی گئی تھی۔

B.5. Al-Idrisi: Nuzhat al-Mushtaq fi `Ikhtraq al- Aafaaq. OPVS Geographicvm sive "Liber ad Eorum Delectationem qui terra Peragrare Student", Institute Universitario Orientale di Neapoli and Institute Italiane per Il Medio ed Estremo oriente, Neapoli-Romae, a.d. MCML XXI, VII, Vol;1970-84.

I.1970; VI+100

II. :IV+103-214.

III. ;IV+217-346.

IV. ;IV+347-521.

ایک عظیم منصوبہ کے مطابق نیپلز یونیورسٹی، اٹلی کے اورینٹل انسٹیٹوٹ اور روم کے ISMEO نے ایک ساتھ ادریسی کی نزهة المشتاق کی مکمل متن کی اشاعت کے لئے مختلف ممالک سے متعلق اجزاء کی تحقیق و ترجمہ کا کام دنیا کے تین ماہر محققین سے کرایا۔ ہندوستان، پاکستان اور مشرق بعید سے متعلق حصے مقبول صاحب کے سپرد ہوئے، اس کام کے لئے ان کو دنیا کی مختلف لائبریریوں کے چودہ مخطوطات بھیجے گئے۔ پھر یہ حصہ مرتب ہونے کے بعد اس کی دوسری جلد میں شائع ہوا۔ یہ ضخیم جغرافیائی تحقیقی کارنامہ سات جلدوں میں مکمل ہونا تھا لیکن سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کی لائبریری میں عربی متن کی صرف چار جلدیں دستیاب ہیں۔ جن کے صفحات کی کل تعداد XVIII+521 ہے۔

ادریسی پر مقبول صاحب کے تین مقالات بھی ہیں:

A-10. Al-Idrisi,

In: *Dictionary of Scientific Biography*, vol.VII, 1973;pp.7-9.

A-11. Al-Idrisi as a Geographer.

In: *History of World Cartography*, Chicago U.P. USA, vol.II.

A-12. Modification of Ptolemy by al-Sharif al-Idrisi.

Quarterly *Islam and Modern Age*, New Delhi, 22/1, February 1991;pp.1-12.

یہ مقالہ History of World Cartography میں بھی بھیجا گیا تھا جو علی گڑھ میں فی الوقت دستیاب نہ ہوئی، اور مقبول صاحب کی آخری کتاب A History of Arab -Islamic Geography کے آخر میں ضمیمہ نمبر ۲ کے طور پر بھی شامل ہے۔ صفحات 397-407

کشمیر کا تاریخی جغرافیہ:

B-6. Historical Geography of Kashmir. Co-author Raja Bano, Ariana Publishing House, New Delhi, 1984; pp.221.

شیخ عبداللہ مرحوم کی خواہش پر مقبول صاحب کی کشمیر یونیورسٹی سے وابستگی کے دوران Centre of Central Asian Studies کا قیام اور سنٹرل ایشیا اور کشمیر کی تاریخ و تہذیب کے متعدد منصوبوں پر کام ہوا تھا، کئی موضوعات پر کتابیں تیار اور شائع ہوئیں۔ ان میں سے زیر بحث چھٹی کتاب تھی جو مقبول صاحب اور راجا بانو کے اشتراک سے تیار ہو کر شائع ہوئی۔

یہ اس اعتبار سے اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف تھی کہ اس میں عرب اور فارسی مصنفین کی قدیم تحریروں سے براہ راست فائدہ اٹھایا گیا تھا، جزوی طور پر فارسی مآخذ کے انگریزی ترجمے پیش کئے گئے تھے اور عرب اہل قلم کی فراہم کردہ معلومات کو وسیع پیمانہ پر استعمال کیا گیا تھا، جبکہ اس سے پہلے Sir Aurel Stien نے صرف سنسکرت کے مآخذ کی مدد سے کشمیر کے قدیم جغرافیہ پر لکھا تھا۔

موجودہ کتاب آٹھویں صدی سے انیسویں صدی تک کشمیر کا حسابی، طبیعیاتی، انسانی اور سیاسی جغرافیہ پیش کرتی ہے اور اس کے مرتبین نے میدانی مطالعہ و مشاہدہ کی مدد سے نئی طبیعیاتی اور انسانی تبدیلیوں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ مزید معلومات کے لئے اس کے سات ابواب کے عنوانات کا خلاصہ کافی ہو گا: قرون وسطی میں کشمیر سے متعلق عربی اور فارسی بیانات۔ وادی کشمیر کی ابتدا،

جائے وقوع، حدود اربعہ، بلندی اور کشمیری نسل۔ موسم، ہوائیں، مٹی اور زمین کی تقسیم اور معدنیات: موتی، جواہر، عطریات و مسالے وغیرہ۔ پہاڑ و پہاڑیاں اور غار، دریا، سیلاب، دلدلی علاقے، زمینی و پہاڑی چشمے اور جھیلیں۔ چراگاہیں اور باغات۔ علاقائی تقسیم: صوبے، قصبے، پرگنے وغیرہ۔ کتاب کے آخر میں معمول کے مطابق موضوع سے متعلق فہرست کتب اور اشاریہ کے علاوہ تین قیمتی نقشے بھی منسلک کئے گئے ہیں۔

تاریخ عرب مسلم جغرافیہ:

B-7 A History of Arab-Islamic Geography (9th-16th Century A.D.)
Aal al-Bayt University, Mafraq, Amman, Jordan, 1416 A.H. /1995 A.D.; pp.XXXV+454.

مقبول صاحب کی زندگی میں یہ ان کی آخری مطبوعہ کتاب ہے اور گویا ان کے پچاس سالہ اسلامی جغرافیہ کی حاصل مطالعہ ہے، اس لئے کچھ تفصیل سے اس کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ مقبول صاحب نے مقدمۂ کتاب میں خود لکھا ہے:

> "اسلامی جغرافیہ پر پانچ سال آکسفورڈ اور لندن میں کام کرنے کے بعد یہ موضوع مجھ پر اس طرح حاوی ہو گیا کہ میں نے باقی زندگی اس کے نذر کر دی... میں عرب۔ اسلامی جغرافیائی افکار و خیالات کی تاریخ لکھنے کی فکر میں رہنے لگا اور اس کے لئے مواد جمع کرتا رہا، لیکن ۱۹۸۴ء میں کشمیر یونیورسٹی سے علی گڑھ واپسی کے بعد مجھے واقعی کام شروع کرنے کا موقع ملا۔
>
> بمبئی یونیورسٹی کی دعوت پر میں نے اس کے Wilson Philological Lecture کے تحت ۱۹۶۳ء میں چھ خطبات دیئے تھے، جو میری موجودہ کتاب "عرب اسلامی جغرافیہ کی تاریخ" کی بنیاد بنے، اس

کام کو میں نے تقریباً چار سال میں مکمل کیا۔ (ان خطبات کی صدارت
پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی نے کی تھی)"۔

پھر موجودہ کام سے پہلے اس موضوع پر ملکی اور غیر ملکی تحقیقی اور تصنیفی کاموں کے ذکر کے بعد لکھا ہے:

"۱۹۶۲ء میں Prof.V.M.Minorsky نے مجھے علی گڑھ میں اطلاع دی کہ ایک روسی اسکالر کراچکوسکی (I.I.Krachkovsky) نے روسی زبان میں عربی زبان کے جغرافیائی لٹریچر پر مفصل کام کیا ہے۔ (۳) میں یقین سے کہتا ہوں کہ صلاح الدین عثمان ہاشم نے اس کا سلیس عربی زبان میں ترجمہ کر کے اسلامی جغرافیہ کی بڑی خدمت انجام دی۔ (۴) مجھے اس کے ایک نسخہ کی سخت ضرورت تھی جو ۱۹۶۴ء میں عرب لیگ کے قاہرہ دفتر نے فراہم کیا۔ میں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا، لیکن Krachkovsky نے عربوں کے جغرافیائی تصورات اور اس علم میں ان کی خدمات سے زیادہ توجہ ان مآخذ کے ادبی پہلو پر کی، ان کی کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی نہیں ہوا تھا، اس لئے مجھے خیال ہوا کہ انگریزی میں ایک مفصل کتاب لکھوں، جس میں عرب مسلم جغرافیہ نگاروں کی حیات اور اس فن میں ان کی خدمات پیش کروں، ان مقاصد نے مجھے موجودہ کام کے لئے آمادہ کیا۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ Krachkovsky کے اس ضخیم کام کے بعد کئی قدیم مصنفین کی کتابوں کے متن چھپ چکے ہیں جو ظاہر ہے کہ ان کو دستیاب نہیں ہوئے تھے۔ بہر حال پوری تواضع سے عرض کرتا ہوں کہ میری یہ کتاب ان کی تصنیف کا مفید ضمیمہ ثابت ہوگی۔

ایک اور بات یہ ہے کہ میری کتاب سولہویں صدی پر ختم ہوتی ہے

جبکہ ان کی کتاب انیسویں صدی تک محیط ہے۔ زندگی رہی اور وقت ملا تو دوسری جلد میں باقی مدت کے جغرافیہ نگاروں کے حالات اور ان کی خدمات کو پیش کرنے کی امید رکھتا ہوں۔

ایک بات کا اور اضافہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ میں نے اواخر قرون وسطی میں ہندوستان میں فارسی زبان میں لکھی جانے والی کئی تصنیفات کا تحلیلی تجزیہ بھی کیا ہے۔"

اس تفصیلی اقتباس سے مقبول صاحب کی اس کتاب کا تعارف اور اس کی اہمیت و وسعت خود واضح ہو جاتی ہے، مختصراً مزید عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے:

پہلا حصہ تین ابواب پر مشتمل ہے، جن کی پندرہ فصول میں ڈیڑھ سو سے زیادہ عرب۔ مسلم مصنفین کے حالات زندگی اور کارناموں کو بترتیب ذیل بیان کیا گیا ہے:

۱۔ قدیم دور از نویں تا دسویں صدی عیسوی: اس باب میں عربوں کی ابتدائی جغرافیائی معلومات سے لے کر ان کی اولین تصنیفات کا ذکر فصل در فصل کیا گیا ہے، جن کا مختصر اندازہ درج ذیل عناوین سے ہو سکتا ہے: فلکیاتی اور فلسفی ادب، تحقیقی رپورٹیں، بحری اور عجائبات دنیا سے متعلق ادب، عراقی اور بلخی مکاتب فکر، جیہانی اور دیگر جغرافیہ نگار، سفارتی رپورٹیں اور سیاحتی بیانات، علاقائی جغرافیہ: مقامی نقشہ سازی سے متعلق ادب، کتب تاریخ، جغرافیائی لغات اور فہارس کتب۔

۲۔ عروج کا دور از گیارہویں تا بارہویں صدی: فلسفی اور فلکیاتی ادب، زراعت، نظم و نسق اور سیاحتیں، کتب جغرافیہ: کائناتی ادب، سیاحتی بیانات اور جغرافیائی لغات۔

۳۔ توسیعی معلومات کا دور از تیرہویں تا سولہویں صدی: فلکیاتی کتب اور دیگر سائنسی ادب، عام اور علاقائی جغرافیہ، سیاحتی بیانات، فضائل سفر اور اماکن مقدسہ کا زیارتی ادب، خطط (شہروں کی تعمیری منصوبہ سازی)، تاریخ: علاقائی جغرافیہ، سطح زمین کے نقشے، لغات نویسی، توصیف کائنات، موسوعات، ملاحوں اور فن

جہاز رانی سے متعلق ادب۔

دوسرے حصہ کی سات فصلوں کی تقسیم یہ ہے: ہیئتی جغرافیہ، حسابی جغرافیہ، طبعیاتی جغرافیہ، عام جغرافیہ، علاقائی جغرافیہ، انسانی اور تہذیبی جغرافیہ اور نقشہ سازی۔ یہ حصہ اس لحاظ سے زیادہ قابل قدر ہے کہ اس میں اسلامی جغرافیہ کے مختلف فنون میں عرب۔ مسلم مصنفین کے خیالات وافکار اور تصورات و معلومات کی ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی قدر و قیمت بیان کی گئی ہے،۔

آخر میں مضمون کتاب سے متعلق معمول کی فہرست کتب، اور اشاریہ کے علاوہ مقبول صاحب کے دو مقالات بطور ضمیمہ اور چھ قدیم نادر تاریخی قیمتی نقشے منسلک ہیں۔

اس معرکتہ الاراء کتاب کی تالیف میں عربی اور فارسی زبانوں کی واقفیت، خاص طور پر عربی مصادر و مراجع پر گہری نظر اور چند دیگر زبانوں میں اس موضوع پر جدید کاموں سے باخبری نے مقبول صاحب کو بہت سہولت پہنچائی۔ جہاں تک محنت شاقہ کا تعلق ہے تو وہ اس کے جوانی سے عادی تھے اور آخر دم تک اس سے کبھی جی نہ چرایا۔ علی گڑھ میں اس کام کے چار سال (۸۴۔۱۹۸۸ء) کے دوران ان کے، ملاقاتی اس بات کی تصدیق کریں گے کہ کیلانگر کے ایک گھر (۵) کے ایک چھوٹے سے، تنگ و تاریک حصہ میں وہ کس انہماک کے ساتھ اس کام میں مشغول رہتے تھے، ان کی زبان پر نہ یہاں کے غیر معمولی بے رحم سرد و گرم موسموں کا شکوہ ہوتا تھا، نہ مچھروں اور بھانت بھانت کے کیڑوں مکوڑوں کی اذیتناک بے تکلفیوں کی شکایت، نہ بار بار بجلی کی نامہربان اندھیر نگری کا ماتم! مقبول صاحب کو بجا احساس تھا کہ یہ کتاب ان کی مدت العمر کی کمائی اور پچاس سالہ علمی زندگی کا نچوڑ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی دیدہ زیب اعلی طباعت سے ان کی آنکھیں روشن ہوئیں!

مذکورہ بالا کتابوں اور مقالات کے علاوہ اسلامی جغرافیہ کے متنوع موضوعات پر مقبول صاحب کے بیشمار مقالات ہیں، یہاں ان کو ذیلی تقسیم کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

موضوعات:

جغرافیہ

A-13. Djughrafiya

In: *Encycopaedia of Islam,* New Edition, Vol.II, 1965; pp.575-587

خریطہ: فن نقشہ سازی

A-14. Kharita

In: *Encyclopaedia of Islam,* New Edition,Vo.IV, 1975; pp.1077-1083.

قرآنی مواد

A-15. Geographical Materials in the Quran.

Bulletin of the Institute of Islamic Studies ,Aligarh, No.6-7, 1962-63; pp.13-19.

تحقیقی موضوعات:

A-16. Arab Geography:

Some Topics for Research and a select Bibliography.

Geographer, Aligarh, No.8-9, 1956-57; pp.27-36.

عربوں کا حصہ

A-17. Arabs' contribution to the Science of Geography in the Middle Ages.*Geographer,* Aligarh, 4/2, December 1951; pp.41-48.

A-18. Two Early Arab Geographers Describe India. *Aligarh Magazine,* Aligarh.1952 pp.....

A-19. Africa as Known to the Arabs.The *Illustrated Weekly of India,* Bombay, 84/26, June 30, 1963; pp.45 and 47, and *Al-Arab,* New Delhi, 2/19-20, September 1, 1963; pp.3-6.

A-20. Arabs and the Rounding of the cape of Good Hope. In: Dr.Zakir Husain presentation volume, Crescent Publishing Works, New Delhi, 1968; pp.90-100.

فارسی ترجمہ:

A-20.4. "دماغہ امید قبل از اروپین" از پوہند میر حسین شاہ

جغرافیہ

Geographical Review of Afghanistan, University of Kabul, Kabul, 8/1, August 1969; pp.

A-21. Multan in the Eyes of Arab Historians and Geographers. Al-Arab, New Delhi, 7/9, September 1968; pp.9-11

عربی ترجمہ:

A-21.5. "الملتان فی نظوالمؤرخین والجغرافیین العرب"
از مسعود الرحمن خاں ندوی صوت الجامعة، ورانسی، ۵/۱،
ستمبر ۱۹۷۳ء، صفحات ۴۱ ـ ۴۸

A-22. Multan as Described by Arab Writers. *Journal of Indian History*, Golden Jubilee Volume, Dept of History, University of Kera a, 1973; pp.361-367.

A-23. The Geography of Bahrain as Described by Greek, Arab and Persian writers. *Journal of West Asian Studies*, Aligarh, No.5-6, 1989-90; pp.1-14

"بحرین صدیوں سے" عنوان پر ایک کانفرنس دسمبر ۸۳ء میں بحرین میں منعقد ہوئی تھی، اس کے لئے یہ مقالہ لکھا گیا تھا۔

A-24. The Vakvak (وقواق) Islands: Indian and Arab Sailor's knowledge of Australia and Paux New Guinea.
In: *Islam Ansiklopedisi*, Turkiye Diyanet Vakfi, Istanbul and as Appendix No.1 in: *A History of Arab-Islamic Geography*, by the author, pp.361-394

شخصیات:

جن شخصیات کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ان کے علاوہ موضوع سے متعلق اہم مصنفین پر مقبول صاحب کے مقالات کی تفصیل یہ ہے:

ابن خرداذبہ

A-25.Ibn Khurradadhbih.
In: *Dictionary of Scientific Biography*, Vol.VII. 1973; pp.356-357.

ابن رستہ

A-26. Ibn Rusta's Account of India.
Geographer, Aligarh, No.7, 1955; pp.43-56.

A-27. Ibn Rusta.
In: *Encyclopaedia of Islam*, New Edition, vol.III, 1971 pp.920-921.

سلیمان تاجر

A-28.Merchant Sulaiman: The First Arab Traveller in India

Al-Arab, New Delhi, 4/3, December 1, 1964;pp.....

A-29. Ibn Sarabiyun. ابن سرابیون: سہراب

In: *Encyclopaedia of Islam*, New Edition, Vol.III. 1971; pp.929-930.

A-30.Al-Maqdisi. المقدسی

In: *Dictionary of Scientific Biography*, Vol.IX.1974;pp.88-89.

البیرونی

A-31.Al-Beruni: An Introduction to his life and writing on the Indian Sciences. A Brochure in co-operation with Prof.Ram Behari & Dr.B.V.Subbarayappa for the Symposium on "Al-Beruni and the Indian Sciences" held on November 8-9, 1971 at National Commission for the compilation of History of Sciences in India, Indian National Science Academy, New Delhi, November 1971; pp.18 and in: *Indian Journal of History of Science*, New Delhi, 10/2, May 1975; pp.98-110, reprinted separately May 1976.

فارسی ترجمہ:

A-31.6. البیرونی و ہند (مجموعہ مقالات) انجمن تاریخ وادب نمبر ۱۰۷، افغانستان اکیڈمی، نمبر ۱۶، ۱۳۵۲ھ (۱۹۷۳ء) صفحات

A-32. Al-Beruni as a Synthesizer and transmitter of Scientific knowledge.

In: Proceedings of the above sympsium on al-Beruni in *Indian Journal of History of Science*, New Delhi, 10/2, May 1975; pp.244-48, Reprinted separately May 1976.

فارسی ترجمہ:

A-32.7. البیرونی بحیثیت رابط وناقل، افغانستان اکیڈمی، سلسلہ نمبر ۱۶، ۱۳۵۲ء (۱۹۷۳ء) صفحات .....

A-33. Road System of India as Described by al-Beruni with map. *Medieval India: A Miscellany*. Dept. of History, Aligarh, vol.II, 1972; pp.1-2.

A-34. Yaqut Hamawi. یاقوت حموی

In: *Dictionary of Scientific Biography*, Vol.XIV. 1976;

pp.546-548.

A-35.Al-Qazwini. القزوینی

In: *Dictionary of Scientific Biography*, Vol.XI. 1975; pp.230-233.

A-36. Ibn Majid. ابن ماجد

In: *Encyclopaedia of Islam*, New Editon, Vol.III, 1971; pp.856-859.

A-37. Ibn Majid.

In: *Dictionary of Scientific Biography*, Vol.IX, 1974; pp.35-37.

A-38. Al-Ma'bari. المعبری

In: *Encyclopaedia of Islam, New Editon*, Vol.V, 1986; p.938.

A-39. Aqil Khan Razi. عاقل خان رازی: (وفات ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء) مصنف واقعات عالمگیری

In: *Encyclopaedia Percica*, New York.(?)

A-40. Abd al-Samad Khan. عبدالصمد خان: (وفات ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء)

In: *Encyclopaedia Percica.*

A-41.Khawaja Abd al-Karim Kashmiri. خواجہ عبدالکریم کشمیری: (وفات بعد ۱۷۸۵ء) مصنف بیان واقع

In:*Encyclopaedia Percica.*

A-42. Abd al-Rahman Shahnawaz Khan. عبدالرحمٰن شاہنواز خاں: (وفات ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء) مصنف مرآۃ آفتاب نما

In: *Encyclopaedia Percica.*

مقامات:

بعض مقامات کا ذکر اوپر بھی گذرا ہے، باقی مقامات پر مقبول صاحب کے مقالے درج ذیل ہیں:

ہندوستان

A-43. Hind: The Geography of India according to the Medieval Muslim Geographers.

In: *Encyclopaedia of Islam*, New Edition, Vol.III, 1971; pp.404-409.

A-44. Djaba: Chamba. جابا

In: *Encyclopaedia of Islam*, New Edition, Vol.II, 1965; p.352.

A-45. Khambayat: Camby in Gujrat. کھمبائت

In: *Encyclopaedia of Islam*, New Edition, Vol.IV, 1978; pp.993-994.

A-46. Bombay. بمبئی

In: *Islam Ansiklopedisi*, Turkiye Diyanet Vokfi, Istanbul, Vol.6, 1992; pp.280-281.

بین الاقوامی تعلقات

مقبول صاحب کا دوسرا خصوصی موضوع International Relations تھا، مطبوعہ مقالات کی رو سے اس کا سراغ ۱۹۵۷ء سے ملنے لگتا ہے، پھر ۱۹۶۷ء میں Centre of West Asian Studies سے پروفیسر اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے وابستگی کے بعد اس موضوع سے دلچسپی میں اضافہ قدرتی تھا، چنانچہ اس کے فوراً بعد اس موضوع پر متواتر کتابیں اور مقالات شائع ہونے لگے، کتابیں درج ذیل ہیں:

عرب ہند تعلقات:

B-8. The Arab World and India (Edited)
Indian Council for Cultural Relations, New Delhi, 1968; pp.....

یہ عنوان اور اس کی اشاعتی تفصیلات مقبول صاحب کے دونوں Bio-data کے مطابق درج کی گئی ہیں جبکہ ہسٹری ڈیپارٹمنٹ سمینار لائبریری کے کیٹلاگ کارڈ میں کتاب کے نام میں کچھ تقدیم و تاخیر اور سن اشاعت میں بھی تبدیلی ہے یعنی India and the Arab World,ICCR, N.D.1969;p.179 مزید وضاحت یہ ہے: Proceedings of the Seminar on India and the Arab World سن اشاعت کے فرق میں طباعت اول و دوم کا احتمال ہو سکتا ہے، لیکن کتاب کے نام کا مسئلہ فی الوقت لاینحل ہے اس

لئے کہ کتاب وہاں بھی مفقود ہے۔

B-9. Indo-Arab Relations.
Indian Council for Cultural Relations, New Delhi, 1st.Ed.
Popular Prakashan, Bombay, 1969; pp.
2nd ed. the Everest Press, Delhi, 1978; pp/ 187

مقبول صاحب سے پہلے اس موضوع پر دو کتابیں تھیں: تاراچند کی Influence of Islam on Indian Culture[6] اور علامہ سید سلیمان ندوی کی "عرب و ہند کے تعلقات"(۷)۔ انہوں نے اس موضوع کو بیسویں صدی تک بڑھایا اور سلسلہ وار تاریخی انداز کے بجائے افکار و خیالات کی بنیاد پر مرتب کیا، یعنی سیاسی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات کے مزاج و کردار کو زیر بحث لائے۔ ان کا بنیادی خیال تھا کہ اگرچہ مختلف زمانوں میں سیاسی وسفارتی روابط اونچ نیچ کا شکار ہوتے رہے لیکن تجارتی اور ثقافتی رشتے صدیوں سے نہ صرف قائم رہے بلکہ بڑھتے رہے۔ قرون وسطی میں علوم وفنون کے کارناموں، دینی و فلسفیانہ خیالات اور معاشرتی و تہذیبی تبادلہ سے دونوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور ایک دوسرے کے ساتھ جینا اور رہنا سہنا سیکھا، ایک دوسرے کی معاشرتی ترقی میں بڑھ چڑھ کر باہم حصہ لیا اور دور حاضر کے علاوہ پھر کسی اور زمانہ میں دونوں قومیں ایک دوسرے سے اتنے قریبی تعلقات استوار نہ کر سکیں۔ حاصل بحث یہ ہے کہ جس انداز میں قدیم زمانہ میں یہ مشترک مفید روابط قائم ہوئے تھے آزادی کے بعد اسی طرح ان کے استحکام کی ناگزیر ضرورت ہے، اس لئے کہ اب دونوں کے سامنے معاشی خود کفالتی و خوشحالی، دینی و سماجی اصلاح اور عالمی امن کے قیام واستحکام کے پریشان کن جدید مسائل ہیں، ان کو حل کرنے کا راستہ صبر آزما اور دشوار گذار ہے اور وہ ان کے درمیان کامیاب تعاون ہی سے مطلوب انجام کو پہنچ سکتے ہیں۔

کتاب صرف چار ابواب میں تقسیم ہے: عرب دنیا سے ہندوستان کے ثقافتی روابط، سفارتی تعلقات اور سیاسی تعاون، ہندو عرب تجارت و کاروبار، عربی ادب میں قدیم

اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی جھلکیاں، اس باب میں عرب سیاحوں اور جغرافیہ نگاروں کے بیانات کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہے اور آخر میں اختتامیہ۔

B.9.3.

عربی ترجمہ:

العلاقات العربية الهندية، ترجمه ڈاکٹر نقولا زیادہ

الدار المتحدة للنشر، بیروت ۱۹۷٤ء، صفحات ٢٧٦

ہند و چین تعلقات:

B-10.

Arabic Classical Accounts of India and China:
English translation with commentary of al-Masalik wal Mamalik by Ibn Khurradadhbih and Akhbar al-Sind wal Hind by Merchant Sulayman and others.
Indian Institute of Advanced Studies, Simla in association with Radhi-India, Calcutta, 1989; pp.

تادم تحریر یہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی اس لئے اس کا تعارف پیش نہ کیا جا سکا۔

عرب و ہند تعلقات سے متعلق مقبول صاحب کے مقالات تاریخ وار درج ذیل ہیں:

A-47. India's Relations with West Asian Countries and the Importance of Persian and Arabic Studies, *Bulletin of the Institute of Islamic Studies*, Aligarh, No.1.1957; op.1-12.

A-48. Arabic Source Material on Indo-Arab Relations. *Medieval India Quarterly*, Aligarh, 3/1-2, July-October 1957; pp.100-108.

A-49. What India owes to the Arabs.
Al-Arab, New Delhi, 2/1, October 1, 1962; pp.10-11 and *Together*, Calicut, 1/2, July 1963; pp.

A-49.8

عربی ترجمہ:

"بماذا تدين الهند للعرب"

صوت الشرق، القاهرة، ۱۳۷/۱۲، اپریل ۱۹٦٤ء، صفحات ۱٤–۱۵، حولیات، کلیة الآداب، جامعة عین شمس، القاهرة، ستمبر ۱۹٦٤ء، صفحات... اور ثقافة الهند، نئی دهلی، ۲/۱۸، اپریل ۱۹٦۷، صفحات ۱۸–۲٦

A-49.9.

اردو ترجمه:

"عربوں کے ہندوستان پر احسانات"

فکر و نظر، علی گڑھ، ۷ / ۳، اپریل ۱۹٦۷ء، صفحات ۷۷–۸۳ اور نشان منزل، بھوپال، خاص نمبر، ۲۰ / ۱۴–۱۷، ۱۵/ اگست ۱۹٦۸ء صفحات ۵۲–۵۳

A-50. Arab contribution to Indian Culture.
Together, Calicut, 1/2 July 1963; pp.

A-51. Commercial Relations of India with the Arab World. Quaterly *Islamic Culture*, Hyderabad, 38/2 April 1964; pp.141-155.

A-51.10.

عربی ترجمه:

"العلاقات التجارية بين الهند والعرب"

ثقافة الهند، نئی دهلی، ۱/۱٦، جنوری ۱۹٦۵ء صفحات ۲۰–۵۳

A-52. Cultural Relations of India with the Arab World.
lecture, delivered at the Institue of Higher Arabic Studies, League of arab Stutes, Cairo,March, March 1964.

A-52.11.

عربی ترجمه:

"العلاقات الثقافية بين الهند والعالم العربی"

صوت الشوق، القاهرة، ۱۳۸/۱۲، منی ۱۹٦٤ء، صفحات ۱۰–۱۱، اور ۱۳۹/۱۲، جون ۱۹٦٤ء، صفحات ۱٤–۱۵ اور ترجمه از عبدالهادی الجوهری برائے ثقافة الهند، نئی دهلی، ۲/۲۱،

اپریل ۱۹۷۱ء، صفحات ۵۴–۷۰

A-53. India's Political Relations with the Arab World.
Al-Arab, New Delhi, 3/4-5, March 22, 1964; pp.4-5 and 7.

A-54. Indo-Arab Relations: Problems and Prospects.
In: *The Arab-World and India*, edited by the author, Indian Council for Cultural Relations, New Delhi, 1963; pp.

A-55. Indians in West Asia.
Al-Arab, New Delhi, 8/7, July 1969; pp.8-10 and Young India, New Delhi, 14/9, September, 1969; pp.

A-56. India and the Muslim World.
The *Illustrated Weekly of India*, Bombay,July 30, 1972; pp.

A-56.12.

عربی ترجمہ:

"الهندو العالم الاسلامی" از مسعود الرحمن خان ندوی

ثقافة الهند، نئی دهلی، ۲۳/۲–۳، اپریل ـ ستمبر ۱۹۷۲ء، صفحات ۱۵۸–۱۷۲

A-57.A Millon Indians Live in the Arab World.
Al-Arab, New Delhi,11/8, August 1972; pp.17-18.

A-58.Welcome Address of the Seminar on "Contemporary West Asian Scene" on January 28-29, 1978 at Aligarh.
In: *Contemporary West Asian Scene*, edited by Mr.Arif Husain Rizvi, Centre of West Asian Studies, AMU, Aligarh, 1980, pp.1-2.

A-59. Muslim contribution to the growth of India's composite culture.
Aligarh Journal of Islamic Thought, Dept. of Philosophy, AMU, Aligarh, Vol.1.1988; pp.44-54.

اسلامی علوم وفنون کی تاریخ

مقبول صاحب کی دلچسپی کا تیسرا موضوع اسلامی علوم وفنون کی تاریخ تھی،

تحریر و تقریر میں اکثر ان کی ترقی و تنزل کے تاریخی اسباب کا تذکرہ ہوتا تھا، موقع موقع سے لیکچرز بھی ہوتے رہتے تھے، Indian National Science Academy, New Delhi. سے بھی ربط تھا، اس کی علمی سرگرمیوں میں شرکت اور اس کے ترجمان Journal of History of Science میں مضامین کی اشاعت بھی ہوتی تھی، اس کے ماتحت National Commission for the Compilation of History of Science in India. کے رکن بھی تھے۔

ان کا خیال تھا کہ اسلامی علوم وفنون کے عروج کے سنہرے دور (آٹھویں تا بارہویں صدی عیسوی) کے بعد زوال وانحطاط کا بنیادی سبب مروجہ نصاب و نظام تعلیم میں اصولی تبدیلی تھی، گیارہویں صدی کے اواخر میں امام ابو حامد غزالی (۱۰۵۹۔۱۱۱۱ء) اور ان کے ہم خیال علماء کی سرکردگی میں اسلامی علوم و فنون کے درمیان دینی اور دنیاوی مضامین کا فرق پیدا کیا گیا، دنیاوی علوم وفنون کو الحاد و گمراہی اور اخروی خسارہ کا موجب مان کر ان کی اہمیت کو دبایا گیا، اور صرف دینی علوم کو دین و دنیا کی فلاح کا باعث مانتے ہوئے ان کی اہمت افزائی کی گئی اور ان کا غلبہ قائم کیا گیا، اس دوررس تبدیلی سے جو نفسیات پیدا ہوئی اس کے چنگل سے آج تک مسلمان آزاد نہ ہو سکے، بلکہ گذشتہ صدی سے علیحدہ علیحدہ دینی اور دنیاوی درسگاہوں کے قیام واستحکام نے اس خلیج کو مزید راسخ کر دیا، نیز غیر ملکی تسلط کے دوران حوصلہ شکن سیاسی وسماجی اور معاشی حالات نے نہ صرف مسلمانوں کو زندگی سے مایوس کیا بلکہ علم و فن سے بچا کھچا لگاؤ بھی نیست ونابود کر دیا اور دینی و دنیاوی جہالت و تاریکی کا دور دورہ ہو گیا، کامیابی کی راہ کا پہلا قدم اب بھی ماضی کی روشن صدیوں کی طرف ذہنی اور فکری واپسی ہے۔

اس طرح کے کبھی مربوط اور کبھی غیر مربوط خیالات خاص طور پر ہم جیسے مدرسہ کے فارغ طلبہ کے سامنے ان کی مجلسی گفتگو کا موضوع ہوتے تھے، اور یہی روح مختلف موضوعات پر ان کی تحریروں میں بکھری ہوئی ہے۔ اسلامی علوم وفنون کی تاریخ پر

اگرچہ انہوں نے کوئی جامع و شامل کتاب الگ سے نہیں لکھی، لیکن مختلف موضوعات کے تحت جن تحریروں کا ذکر اوپر گذرا ہے ان میں سے اکثر جزوی طور پر اسی موضوع سے متعلق ہیں، باقی مقالات درج ذیل ہیں:

A-60. The Florescence and Decline of Islamic Society in the Middle Ages.

In: *Proceedings of the Asian History Congress*, Indian Council for Cultural Relations, New Delhi, 1968;pp.

A-60.13

اردو ترجمہ:

"اسلامی معاشرہ کے تنزل کا اہم سبب" از عابد رضا بیدار

برہان، دہلی، ۵۸/۱، جنوری ۱۹۶۷ء صفحات ۴۸۔۵۹

کتابچہ بعنوان بالا، انسٹیٹوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، رامپور

A-61. Islam and Science in History.

In:*India and contemporary Islam*, Proceedings of the Seminar on the same topic on May 1967, edited by S.T.I.okhandwalla, Indian Institute of Advanced Studies, Simla, 1971;pp.311-316 and

Transactions of the Indian Institute of Advanced Studies, Simla, vol.VI, 1971;-pp.

A-62. Socio-Economic Causes of the Decline of Science in Islam during the Middle Ages.

In: *Studes Araber et Islamiaues*-1: Histoire et civilization, vol.I.Actesdu xxix Congress International des Orientalistes, Section Organises par clauds Cachen, Pari, 1975. Published by L'Asiatheque.

A-63. A Survey of Islamic Studies: Keynote Address of the Seminar on "contribution of India to Islamic Studies", AMU, Aligarh, on March 11-13, 1986.

Bulletin of the Institute of Islamic Studies, Aligarh, No.17-21,

1984-88; pp.1-12.

A-64. Unani Medicine and Allopathy: A Comparative Study. Khuda Bakhsh Memorial Lecture, January 1985.
Khuda Bakhsh Oriental Public Library Journal, Patna, No.48, 1988;pp.1-15 and Brochure by the above title from the same library, 1993; pp.15.

A-65.

اسلامک اسٹڈیز کی تاریخ اور اس کے تحقیقی مسائل۔
سہ ماہی اسلام اور عصر جدید، نئی دہلی، ۲۲/۱، جنوری ۱۹۹۰ء، صفحات ۵۔ ۱۸

A-66.

اسلام کے عہد وسطیٰ میں سائنس اور ٹکنالوجی کا فروغ۔
سہ ماہی اسلام اور عصر جدید، نئی دہلی، ۲۲/ ۲، اپریل ۱۹۹۰ء، صفحات ۵۔۱۶

متفرق

عربوں اور مسلمانان ہند کے سیاسی و سماجی اور تعلیمی و تہذیبی مسائل بھی مقبول صاحب کی دلچسپی کا موضوع بنے ہیں، ان تحریروں میں ان کا نقطہ نظر ہندوستان کے سیکولر مسلم دانشوروں کے معروف افکار و خیالات کی نمائندگی کرتا ہے، اگرچہ ان کے مزاج کی نرمی اور قلم کی شرافت ان کو زیادہ بیباک نہیں ہوتے دیتی، اس نوعیت کے اور دیگر مطبوعہ مقالات کی تفصیل یہ ہے:

A-67. Future of Arab Studies in India.
Al-Arab, New Delhi, 1/21-22, August 15, 1962; pp.4-5.

A-68. Genesis of Arab Nationalism.
Al-Arab, New Delhi, 2/10, March 22, 1963; pp.3 and 15.

A-69. Nehru's Prestige in the Arab World.
Al-Arab, New Delhi, 3/8-9, July 1, 1964; pp.8-9.

A-70. Islam and Medieval and Modern Societies.
Transactions of the Indian Institute of Advanced Stuties, Simla, vol.I, 1966; pp.

A-71. Social Reforms in Arab context: A Study of UAR and Algeria.
Al-Arab, New Delhi, 6/3, March 1967; pp.6-7 and 13.

A-72. The position of Urdu in India Today.
Transactions of the Indian Institute of Advanced Studies, Simla, No.VIII, 1969; pp.
A-72.14.

اردو ترجمہ:

"موجودہ ہندوستان میں اردو کی حیثیت"
سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ، ۸/ ۲، جنوری ۱۹۶۸ء، صفحات ۸۶۔۹۰

A-73 عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے

کتاب بعنوان بالا مرتبہ سید اوصاف علی اور عابد رضا بیدار، بسلسلہ قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان (نمبر ۴) رامپور انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، دہلی، ۱۹۶۹ء، صفحات ۷۵۔۸۴

A-74. Gandhi and Islam.
Transactions of the Indian Institute of Advanced Studies, Simla, No.XI, 1969; pp.
A-74.15.

اردو ترجمہ:

گاندھی جی اور اسلام
سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ، گاندھی نمبر، ۱۹۶۹، صفحات ۲۴۔۴۳

A-75. Madarsa System of Education and India Muslim Society.
In: *India and Contemporary Islam*, edited by S.T.Lokhadawalla, 1971; pp.25-36 and
Transactions of the Indian Institute of Advanced Studies, Simla, Vol.VI, 1971;pp.

A-76. Problems of the Muslims of India.
Keynote Address of the Seminar on the "Problems of the Muslims of India."
The Secularist, Bombay, December 1971; pp.

دنیائے اسلام کے مصلحین میں سر سید کا مقام
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ، علی گڑھ، ۹/۱، ۸/ نومبر ۱۹۷۲ء، صفحات ۱۔ ۴

A-78.

رپورٹ اجلاس ہفتم آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس
(منعقدہ دار العلوم تاج المساجد، بھوپال، ۹۔۱۱/ ستمبر ۱۹۷۴ء)
مجلہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ ۱۱/۱۔ ۲، ۷۰۔۱۹۷۵ء، صفحات ۳۳۔۳۹
پندرہ روزہ نشان منزل، بھوپال، خاص نمبر بیاد کانفرنس بالا، مرتبہ مسعود الرحمٰن خان ندوی، ۲۶/ ۲۰۔ ۲۴، جنوری ۱۹۷۵ء، صفحات ۳۳۔۲۹

A-79.

روایت و تجدد: جدید نقطۂ نظر
(برائے سمینار "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" منعقدہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۲۶۔۲۹/ دسمبر ۱۹۷۶ء)
فکر اسلامی کی تشکیل جدید، مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی اور مشیر الحق، ذاکر حسین انسٹیٹوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء، صفحات ۲۲۷۔ ۲۳۲۔

A-80. The Resurgence of Islam.
(For Seminar on Islamic Resurgence, Iqbal Institute, Kashmir University, Srinagar on

A-81. Approach and scope of the Encyclopeadia Kashmiriana. The Cultural Academy, Srinagar, 1979; pp.

A-82. The First Edition of Hafiz Abru's Tarikh.
Quarterly Islam and Modern Age, New Delhi, 21/2, May 1990; pp.89-100.

A-83.

اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سر سید احمد خان کا مرتبہ

چوتھا سرسید یادگاری خطبہ زیر اہتمام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز اسوسی ایشن، دہلی بتاریخ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۸ء
کتابچہ مطبوعہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، فروری ۱۹۹۱ء، صفحات ۳۲۔

طالبعلمی کے زمانہ کے مقالات:

حسن اتفاق سے مقبول صاحب کی بمبئی میں تعلیم کے دور کے چند مقالات کے نام بھی ہم کو ملتے ہیں، جن سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی لکھنے پڑھنے کی سرگرمی صرف انگلینڈ کے قیام از ۱۹۴۵ء برائے ریسرچ کی رہین منت نہیں ہے، بلکہ ان کو یہ لت بمبئی میں بی اے کی تعلیم از ۱۹۴۱ء ہی سے پڑ چکی تھی، بہر حال وہ یادگاری مقالات یہ ہیں:

A-84.

خیر الکلام ماقلّ و دلّ (عربی زبان میں)

The Palms, Bombay, 9/2,(?) March 1941;pp.

A-85. A Blind Philosopher Poet of the Arabs.

The Palms, Bombay, 9/1, (?), October 1941; pp.

A-86.

بمبئی میں عربی تعلیم (اردو زبان میں)

The Palms, Bombay, 10/1, (?), October 1941;pp.

B-11.

اردو ناول:

مٹی سے ہیرا۔
ناولستان، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، صفحات ۶۳

مذکورہ بالا تمام کام سوائے عربی متن کی تحقیق اور چند اردو مقالات کے انگریزی زبان میں تھے جو عمر بھر مقبول صاحب کی تحریر و تقریر اور تصنیف و تالیف کی زبان رہی، لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں قیام (۸۹-۱۹۹۱) کے دوران اردو زبان کی طرف توجہ ہوئی اور اس میں بھی طبع آزمائی شروع کی، اس کے لئے برجستہ رواں زبان اور دلچسپی کے

ہلکے پھلکے موضوعات اختیار کئے جیسے زیر بحث ناول "مٹی سے ہیرا" یا "آپ بیتی"۔ آخرالذکر کی دکھ بھری داستان غیر مطبوعہ تحریروں میں بیان ہوگی، فی الوقت اس ناول کا تذکرہ کیا جاتا ہے جس کی فنی قدر و قیمت تو تنقید نگاروں کا کام ہے، یہاں تو صرف اس کہانی کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جس سے صرف لکھنے والے کی آراء وافکار پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

یہ داستان معاصر مسلم سماج میں خصوصاً عورتوں کی تعلیم اور نکاح و طلاق وغیرہ مسائل کے بارے میں ناول نگار اور ان کے حلقۂ دانشوری کے خیالات کی ترجمان ہے، اس میں نام لئے بغیر شاہ بانو کیس کے پس منظر میں اٹھنے والے ہنگامہ کی صدائے بازگشت بھی مدھم لہجہ میں ملتی ہے، ناول کی ہیروئن ریحانہ آٹھواں کلاس پاس ایک غریب دیہاتی خاندان کی چوتھی اور سب سے چھوٹی لڑکی ہے، اس کی شادی ایک تعلیم یافتہ مالدار خاندان کے ایم اے پاس لڑکے حمید الدین سے خود اس کی اور اس کے خاندان کی پسند سے ہوتی ہے، لیکن شادی کے بعد اس امیر گھرانہ میں پہلے ساس کی طرف سے غریب دولہن کی ناقدری شروع ہوتی ہے، پھر سسر اور شوہر بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں، دو سال کے اندر ہی مہناز بچی بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن شوہر کی بیزاری اور ظلم و ستم روز بروز بڑھتا جاتا ہے، آخر وہ اپنے ایک بد چلن دوست سلیم کی بری صحبت میں نہ صرف ریحانہ سے بالکل کٹ جاتا ہے بلکہ سلیم کی بہن مہرالنساء سے شادی رچا لیتا ہے اور دوسری شادی کی شرط کے مطابق پہلی بیوی ریحانہ کو طلاق دے کر ذلت کے ساتھ کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیتا ہے۔

اس دوران ریحانہ کا بڑا بھائی رفیع ایل ایل بی پاس کر کے الہ آباد میں وکالت شروع کر چکا تھا، وہی اس کو اپنے ساتھ ماں کے پاس گھر لے گیا، کچھ دن کے اندر ہی شوہر کے وکیل کی طرف سے سلیم کی جھوٹی شہادت کے ساتھ نافرمانی کی بنیاد پر طلاق کا پروانہ، قاعدہ کے مطابق پانچ ہزار مہر اور عدت کے ایام کا نفقہ سو روپیہ ماہانہ کے حساب سے تین سو تینتیس روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجے جانے کی اطلاع ملی، نیز یہ مطالبہ کہ پندرہ دن کے

اندر اندر بچی شوہر کے حوالہ کردی جائے ورنہ قانونی کاروائی ہوگی۔ طلاق کی بدنامی اور بھائی پر بوجھ بننے کے احساس سے مجبور ہو کر اس نے بچی کے ساتھ خودکشی کی کوشش کی جس کو بھائی نے نہ صرف ناکام بنایا بلکہ بیرسٹر منظور کی مدد سے اس کو اور اس کی بچی کو عدالت سے ان کے حقوق دلوائے۔

اس دوران ریحانہ نے دسویں کلاس کا پرائیوٹ امتحان دے کر ٹیچرز ٹریننگ کورس بھی کر لیا تھا اور اپنے علاقہ کے اسکول میں عزت و آبرو کی ملازمت بھی حاصل کر لی تھی، نیز گذشتہ تلخ تجربہ سے سبق حاصل کرنے کے بعد مسلم عورتوں میں سماجی سدھار کا کام شروع کیا، ایک اصلاحی انجمن بنائی اور لڑکیوں کی مفت تعلیم کے لئے مسلم گرلز اسکول قائم کیا۔ یہ ہے ایک ستم زدہ نادار عورت کی کامیاب جدوجہد کی داستان جس میں ناول نگار نے دینی و سماجی مسائل کے بارے میں اپنے افکار و خیالات کو جگہ جگہ ٹانک دیا ہے، ہیرو اور ہیروئن کے خاندان کے تعارف کے درج ذیل دو اقتباسات سے ناول نگار کی پسند و ناپسند کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ہیروئن کے خاندان کے تعارف میں لکھا ہے:

"ریحانہ کے خاندان والے مذہبی ضرور تھے مگر روزے نماز اور خیر خیرات کی حد تک۔ ان میں کسی طرح کا مذہبی تعصب، فرقہ پرستی یا پرانے خیالات کی پرستش نہ تھی۔ یہ لوگ غریب ضرور تھے مگر ان میں مذہبی کٹرپن نہ تھا۔ یہ سب باپ کی پرورش اور خیالات کا نتیجہ تھا۔ تقریباً سبھی بھائی بہنوں کو موسیقی سے دلچسپی تھی اور گاتے بھی تھے۔ صوفیوں اور اولیاء سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ گھر میں نہ عورتیں پردہ کرتی تھیں اور نہ سڑک پر نکلنے میں انہیں کوئی عار تھی۔(۸)"

ہیرو اور اس کے خاندان کے تعارف میں تحریر کیا ہے:

"ریحانہ کے سسر کو اس کی زیادہ فکر تھی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے، کیونکہ اسلام میں پردہ لازمی ہے اور نماز روزہ پابندی سے ادا کرے۔

وحیدالدین کا تعلق چند مذہبی سیاسی جماعتوں سے تھااور وہ خود بھی مذہب کے پابند تھے۔ ریحانہ نے اپنے میکہ میں ایک آزاد زندگی گزاری تھی، وہاں اس پر کوئی پابندی نہ تھی، مگر یہ دنیااس کے لئے نئی تھی۔ وحیدالدین کے گھر میں طرح طرح کے لوگ آتے تھے اور فرقہ وارانہ گفتگو بھی کرتے تھے۔ وہ سب کی باتیں خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھ کر سنتی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچتی تھی کہ اس طرح کی باتیں تنگ نظری کی دلیل ہیں، گھر میں یہ لوگ دوسرے مذہبوں کے لوگوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور مذہب کے نام پر اکسانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ریحانہ کے باپ منیر احمد نے کبھی بھی ایسی باتیں نہیں کیں، چونکہ وہ صوفیا اور اولیاء کے بیحد قائل تھے اس لئے ہمیشہ تلقین کرتے تھے کہ سب کو آپس میں پیار و محبت سے پیش آنا چاہیے، دنیا کا ہر انسان خدا کی مخلوق ہے، سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، کوئی رنگ و نسل کی تمیز نہیں ہونا چاہیے اور نہ کوئی اونچ نیچ، سب انسان برابر ہیں، ایک دوسرے کے مذہب کی برائی نہیں کرنا چاہئیے، اس سے فرقہ پرستی بڑھتی ہے۔"(۹)

اس کے علاوہ مقبول صاحب نے اپنی "آپ بیتی" میں لکھا ہے کہ انہوں نے دوسرا ناول "کرشنا" کے نام سے شروع کر دیا ہے، لیکن افسوس کہ وہ میری نظر سے نہیں گذرا۔

فصل دوم

غیر مطبوعہ تحریریں

پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ دونا مکمل فہرستوں کی بنیاد پر مقبول صاحب کی مطبوعہ تحریروں کو نئی ترتیب اور تعارف کے ساتھ یہاں پیش کیا گیا ہے، نیز ان کے آخری سات سال کی تحریروں کا ریکارڈ موجود نہیں ہے، حالانکہ وہ وفات سے تقریباً دو سال پہلے تک معمول کے مطابق سرگرم عمل رہے اور خود مرض سے افاقہ کے درمیانی وقفوں میں بھی ان کو اپنے نامکمل کاموں کی فکر گھیرے رہتی تھی۔ بہر حال خوش قسمتی سے فہرست ۱۹۸۵ء کے آخر میں ان کی غیر مطبوعہ بعض تحریروں کا ذکر بھی ہے جو متعلقہ اداروں یا رسالوں کو بھیجی جاچکی تھیں، نیز وہ کتابیں بھی مذکور ہیں جو ان کے زیر کار تھیں یا ان کے منصوبہ میں شامل تھیں۔ ان میں سے جن کی اشاعت کا ہم کو علم ہو سکا ان کو اوپر کی ترتیب میں ضم کر لیا گیا، جن کی اشاعت کا ابتک علم نہ ہو سکا، ان کو اس غرض سے ذیل میں درج کیا جاتا ہے کہ آئندہ ان کے کاموں کی مکمل فہرست تیار کرنے میں آسانی ہو۔

غیر مطبوعہ کتب

B-12.

تاریخ حافظ ابرو: (فارسی)

حافظ ابرو کا نام عبداللہ بن لطف اللہ ہے، ان کا سن وفات ۸۳۳ھ / ۱۴۳۰ء ہے، فارسی زبان میں ان کی مذکورہ تاریخ کے متن کو ایڈٹ کرنے کے لئے Prof.A.K.S.Lambton نے مقبول صاحب کو Dept. of Middle Eastern History, School of Oriental and African Studies, London University

کی طرف سے دعوت دی اور دو سال کے لئے Visiting Professor کی پیشکش کی، وہاں قیام ۷۴۔۱۹۷۶ء کے دوران مقبول صاحب نے یہ کام انجام دیا پھر ہر مصنف کی طرح ان کو بھی اس کی اشاعت کی فکر لاحق ہوئی، ۱۹۸۵ء کی فہرست میں درج ہے کہ Tajik Academy of Science, Dushanbe, Tajikistan سے شائع ہو گی، خیال آتا ہے کہ کسی وقت ایران سے اشاعت کے لئے سلسلہ جنبانی بھی شروع ہوئی تھی، آخری کتاب A History of Arab-Islamic Geography کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ کبھی Indian National Science Academy, New Delhi شائع کرے گی۔ان کی حیات میں جب اس کتاب کا یہ حشر ہوا تو بعد وفات کیا انجام ہو گا؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔ بہر حال اس کا تعارف خود مقبول صاحب کے قلم سے ایک مقالہ میں شائع ہوا ہے۔ (دیکھئے مطبوعہ مقالات نمبر A-82)

B.13.

آپ بیتی: (اردو زبان میں)

۱۹۹۰ء میں مذکورہ اردو ناول کی اشاعت کے بعد مقبول صاحب کو اردو زبان میں اپنی سرگزشت حیات لکھنے کا خیال آیا، پوری کتاب ۱۹۹۲ء میں لکھی گئی جیسا کہ اس میں متعدد جگہ مذکور ہے، صرف "بیسویں صدی سابقہ صدیوں سے ممتاز" اور "سفر نامہ تاجکستان ۱۹۸۳ء، بالترتیب ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء میں تحریر ہوئے لیکن کتاب ۱۹۹۲ء کے بعد ہی ذاتی خرچ پر اشاعت کے لئے دہلی کے رفقائے کار کے حوالہ کر دی گئی، اس وقت سے اس کی المناک دل دوز داستان کا آغاز ہوتا ہے! ان کو تھوڑی سی تعداد میں اس کی جلد اشاعت کی فکر تھی کہ اپنے ہاتھ سے اپنے اعزہ و احباب کو نذر کر سکیں، اس لئے متعلقہ رفقاء سے برابر رابطہ اور اپنے مخصوص دھیمے انداز میں یاد دہانی یا تقاضہ جاری رہا، امروز و فردا کے وعدوں پر دن رات گذرتے رہے، دل بہلانے والی کوئی اطلاع ملتی تو خوش ہوتے اور ہر تعلق والے شخص سے خوشی سے تذکرہ کرتے، آخر زمانہ میں ایسے ہی کسی چھلاوے

کی خبر ملی تو کینسر کے علاج کے دوران لندن سے خط مورخہ ۷/جون ۱۹۹۶ء کو مجھے تحریر بھی کیا:

"میری سوانح حیات جو ---- شائع کر رہا ہے اس کی کتابت اب مکمل ہو گئی ہے اور انشاء اللہ میرے ہندوستان دسمبر ۱۹۹۶ء میں آنے پر شائع ہو جائیگی۔ ابھی اس میں چند تصویریں اور خطوط شامل کرنا باقی ہیں، وہ میں اپنے ساتھ ہندوستان لاؤں گا۔"

بیماری میں کچھ افاقہ ہوا تو حسب پروگرام ۹/دسمبر ۱۹۹۶ء کو ہندوستان تشریف لائے، تقریباً تین ماہ قیام فرمایا لیکن وہ مبارک ساعت نہ آنا تھی، نہ آئی! وعدۂ فردا پر ۵/مارچ ۱۹۹۷ء کو دہلی سے لندن روانہ ہو گئے اور وہاں سے مع بیگم اپنی بیٹی جنیفر کے ساتھ مستقل قیام کی نیت سے Windermere, Cumbria, U.K. منتقل ہو گئے۔ دہلی سے کتاب کی اشاعت میں تاخیر پر تاخیر سے کبیدہ خاطر ہو کر گئے ہونگے اس لئے مجبور ہو کر ونڈر میر سے خط مورخہ ۲۹/اپریل ۱۹۹۷ء میں لکھا:

"دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری سوانح حیات..... شائع کر رہے ہیں، مگر اس کی اشاعت میں کافی تاخیر ہو گئی ہے۔ آپ کو زحمت دے رہا ہوں کہ دہلی جاکر..... ملاقات کر لیجئے، وہ کافی مشغول آدمی ہیں۔ کتاب کی اشاعت میں ان کی مدد کر دیجئے۔ آپ کو کافی تجربہ ہے، شاید پروف پڑھنے میں آپ مدد کر سکیں، پروف کی دوسری کاپی تیار ہو رہی ہے۔

میں انہیں Rs.30,000 (تیس ہزار روپئے) سے زیادہ دے چکا ہوں، اور تصویریں بھی دے دی ہیں۔ آپ مدد کر دیں گے تو یہ کام جلد ہو جائیگا۔

ان سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ جہاں تک میں لکھ چکا ہوں یعنی ۱۹۹۰ء

تک، بس وہیں ختم کردیں اور چھاپ دیں۔ باقی حالات اگر زندگی رہی تو
لکھ دونگا اور الگ سے شائع ہو جائیں گے۔"

اس خط کے بعد میرے قدیم ساتھی اور مخلص دوست پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی (استاد شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کے واسطۂ خیر سے فون اور خطوط کے ذریعہ یاددہانی اور تقاضوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا، خاص اس مقصد کے لئے دہلی کا ایک بے سود سفر بھی ۲۳ر مئی ۱۹۹۷ء کو کیا جس میں متعلق صاحب سے ملاقات تک نہ ہو سکی، واسطہ در واسطہ پر اعتماد کرنا پڑا، اشارہ کنایہ میں کینسر کے بعد سے مقبول صاحب کی گرتی ہوئی صحت کا حوالہ بھی دیا گیا، مگر بے حسی کی بھی حد ہوتی ہے، کانوں پر جوں نہ رینگنا تھی، نہ رینگی! فرضی تاریخوں کے خالی خولی ٹالنے والے وعدے ہوتے رہے، ادھر حسن ظن کے مارے مقبول صاحب خیر کی آس لگائے انتظار کی گھڑیاں گنتے رہے، پھر خط مورخہ ۱۲ر اگست ۱۹۹۷ء میں اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا، حالانکہ بہت پہلے اس کھیل کو سمجھ لینا چاہئیے تھا۔ لکھتے ہیں:

"آپ نے بڑی زحمت کی جو میری سوانح حیات کے سلسلہ میں آپ کو اٹھانا پڑی!

میں جب مارچ (۱۹۹۷ء) میں دہلی میں تھا اس وقت بھی اس کتاب کا دوسرا پروف پڑھا جارہا تھا، اور میں نے خود بھی کچھ حصے دیکھ لئے تھے، اس لئے مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں یہ کتاب پڑی نہ رہ جائے، حالانکہ میں نے..... کو روپیہ بھی دیدیا تھا اور تصویریں بھی جو اس میں شامل ہونگی۔

..... نے اپنے ذمے اتنے کام لے لئے ہیں کہ مجھے ڈر تھا اور اب بھی ہے کہ میرے آنے تک یعنی اکتوبر (۱۹۹۷ء) تک یہ کتاب شائع نہ ہو گی! حالانکہ ان کا خط آیا تھا کہ وہ اگست (۱۹۹۷ء) میں مکمل کردیں گے۔ میں ظاہر ہے دہلی میں زیادہ دن نہیں رہ سکتا، اسی لئے آپ کے ذمہ یہ کام کردیا

تھا۔

میں انشاءاللہ اکتوبر (۱۹۹۷ء) تک ہندوستان آرہا ہوں.....

میری طرف سے ضیاء الحسن کا بہت بہت شکریہ ادا کردیجئے گا کہ

انہوں نے.....سے میری کتاب کے سلسلے میں گفتگو کی۔"

مقبول صاحب حسب پروگرام ۲۱/اکتوبر ۱۹۹۷ء کو آخری بار ہندوستان تشریف لائے اور اس کتاب کے سلسلہ میں دل برداشتہ ۲۱/ فروری ۱۹۹۸ء کو بمبئی کی خاک میں پیوست ہوگئے!

ان پورے چار ماہ کے دوران بھی درمیانی واسطوں کی طرف سے منت وسماجت کے ساتھ یاد دہانیوں اور دوسری طرف سے جھلاوں کا نہ ختم ہونے والا اذیت ناک سلسلہ جاری رہا، تو وفات سے کوئی بیس دن پہلے طبیعت کی خرابی اور مزید کمزوری کی اطلاع کے ساتھ ساجد کے پاس پیغام آیا کہ وہ کتاب جس حال میں بھی ہو مع تمام متعلقہ چیزوں کو حاصل کر کے لیتے آؤ، حسب معمول اس کی فوری اطلاع ضیاء الحسن کے ذریعہ فون سے دہلی کی گئی لیکن بے سود! اس لئے کہ معاملہ اگر کسی شریف ذمہ دار انسان سے ہو تو وہ حالات کی نزاکت، قریب المرگ محسن کی دلداری اور اپنی عزت کا لحاظ کرے! پھر جب ۱۸/ فروری ۱۹۹۸ء کی صبح ساجد کتاب ومالہ وماعلیہ واپس لینے دہلی پہنچے تو پورا دن ضائع کرنے کے بعد صرف پروف جس حالت میں ملا وہ نہ تو کسی حال میں پورا تیار تھا، نہ اس کی پوری پروف ریڈنگ ہوئی تھی اور وہ نہ پریس بھیجنے کے قابل تھا، تاریخی یادگار فوٹو ملے نہیں کہ متعلقہ دو صاحبان کے درمیان یہ فیصلہ نہ ہوپاتا تھا کہ آخرفی الوقت وہ کس کی تحویل میں ہیں؟ مالی معاملات کی صفائی میں تو بڑے بڑے صاحب حیثیت خوشحال حتیٰ کہ دیندار افراد تک کا پہلو کمزور ہوتا ہے، اب کیا کسی کا گلہ کرے کوئی؟

اس تلخ داستان کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ ۱۹/ فروری ۱۹۹۷ء کی شب میں جب ساجد وہ کتاب لے کر بمبئی پہنچے ہوں گے تو اس کا حشر دیکھ کر وفات سے صرف

چھتیس گھنٹے پہلے بستر مرگ پر سب کے ہمدرد و بہی خواہ اور مخلص و محسن نازک دل پر کیا گذری ہو گی؟ ہر ذی شعور انسان اندازہ کر سکتا ہے، مزید بیان کی ضرورت نہیں!

B-14. Science and Technology in Islam.

مقبول صاحب کی غیر مطبوعہ "آپ بیتی" میں اس کتاب کا نام ملتا ہے کہ Indian National Science Academy کے لئے مختصر مگر جامع کتاب تیار ہو گئی ہے۔

B-15.

نیز مذکورہ اکیڈمی نے "ہندوستان میں سائنسی ترقیات پندرھویں سے انیسویں صدی تک" ایک پروجیکٹ کے ضمن میں جغرافیہ پر کام مقبول صاحب کے سپرد کیا تھا اس کے بارے میں بھی انہوں نے لکھا کہ یہ اب تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔

مقالات مرسلہ برائے اشاعت: Articles submitted for publications

A-87. Islamic Cartography with Special Reference to the World Map of al-Khwarizmi Based on Ptolemy.
6th International Conference of the History of Cartography, National Maritime Museum, Greenwich, England, 1975.

A-88. University Education in the Islamic World.
Seminar on "Islamic Thought", Krays, Algeria, 1978.

A-89. India as viewed by Arabs and other Asians.
In: *The Cultural Heritage of India*, Vol.VII, Ramkrishna Mission, Calcutta.

A-90. India's contribution to Arabic Literature.
As above.

برائے اشاعت تیار مقالات Articles Ready for Press:

A-91. Growth of Arabic Geographical knowledge.
Lecture delivered at the Indian Institute of Advanced Studies, Simla, 1967.

A-92. Ibn Sina and Terra Incognita.
Ibn Sina Millenary Birth Anniversary Celebrations. Centre of Central Asian Studies, Kashmir University, Srinagar, 1981.

A-93. Ibn Sina on Mineralogy and Meterology.
Ibn Sina Millenary Celebrations, Council for Scientific Industrial Research, New Delhi.

A-94. Central Asia and India.
Centre of Central Asian Studies, Kashmir University, Srinagar.

A-95. History of Science in India and the Importance of Extant Manuscripts on Science in Arabic and Persian.

A-96. Tasawwuf.
Keynote paper for the Seminar on "Manuscripts on Tasawwuf", Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna held at Aligarh, 1985.

اس نئی فہرست کے حساب سے ابتک مقبول صاحب کی کل پندرہ کتابوں کا ہم کو علم ہو تا ہے۔ جن میں سے تین کے اردو یا عربی ترجمے ہوئے، نیز کل چھیانوے مقالات میں سے پندرہ کے اردو، عربی یا فارسی ترجمے بھی ہوئے۔ خیال ہے کہ مزید تلاش و جستجو سے اس تعداد میں اضافہ ہو گا۔

Books in Progress:

زیر ترتیب کتابیں

1. Geographical Portion of al-Masudi's Muruj al-Dhahab wa Ma'adin al-Jauhar: English Translation with commentary.
2. Author of one section of History of Civilization of Central Asia, vol.III (A.D.250-750): History of Eastern Turkestan for UNESCO, Paris.
3. introduction and Epilogue of Aspects of Islamic Culture, Vol.IV. edited by Prof.A.Y.al-Hasan for UNESCO,Paris.
4.

یونیسکو کے پروجیکٹ Aspects of Islamic Culture کی چوتھی جلد Science in Islam کے مقبول صاحب Co-Editor تھے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، اس کے مضامین کی تنقیح کا کام شروع ہو چکا تھا اور مقبول صاحب اس کام میں مشغول تھے، وفات سے صرف دس ماہ پہلے خط مورخہ ۲۹/اپریل ۱۹۹۷ء میں لکھا تھا:

"آج کل میں کافی مشغول ہوں، یونیسکو سے جو کتاب سائنس پر
چھپ رہی ہے اس کے مضامین دیکھ رہا ہوں۔"

اب نہ معلوم وہ کتاب کس مرحلہ میں ہے؟

مطبوعہ مقالات و تقریروں کے زیر ترتیب مجموعے:

Collection of Articles under Preparation

متنوع موضوعات پر مقبول صاحب کے مطبوعہ مقالات کا بیان اوپر گذر چکا، تقریریں اور لکچر بھی ہوتے رہتے تھے، ایک زمانہ میں ان کو مختلف عناوین کے تحت یکجا کرنے کا خیال آیا تو درج ذیل منصوبہ بنایا:

1. Studies in Islamic Geography.

اس مجموعہ میں مختلف Encyclopaedias میں ان کے مطبوعہ مقالات جمع کرنا تھا۔

2. India and West Asia.

اس مجموعہ میں ہند و عرب تعلقات سے متعلق ان کے مقالات و لکچرس طبع کرنا تھا۔

3. Islamic Society and India.

اس مجموعہ میں مسلمانان ہند کے مسائل سے متعلق مقالات اور تقریریں یکجا ہوتیں۔

نامکمل منصوبہ:

Dictionary of Islam.

آخر میں اس منصوبہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو تقریباً سال ڈیڑھ سال پہلے مقبول صاحب کی توجہ کا مرکز بنا اور ملاقاتوں میں اس کا تذکرہ شروع ہوا، لیکن افسوس کہ ان کی وفات سے گویا اپنی ابتدا ہی میں دھرا کا دھرا رہ گیا، موضوع کے اعتبار سے یہ ایک مبارک کام تھا، یعنی ایک ایسی قاموس کی تیاری جو اسلام کے تعارف میں تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے یکساں طور پر مفید ہو۔ حسن اتفاق سے اس منصوبہ کی تفصیل خود ان کے الفاظ میں پیش کی جاسکتی ہے۔ وفات سے دس ماہ قبل خط مورخہ ۲۹/اپریل ۱۹۹۷ء میں تحریر کرتے ہیں:

..اس کے علاوہ ایک نیا کام شروع کیا ہے، یہ ہے Dictionary of Islam جو دہلی کے پبلشر UBS شائع کریں گے، تقریباً سات سو صفحے کی کتاب ہو گی، اس کا مقصد یہ ہو گا کہ غیر مسلم اس کے ذریعہ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ UBS والے کہتے ہیں کہ یہ کتاب خوب بکے گی، اور اس کی ضرورت بھی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کو بعد میں لکھوں گا..... یہ ڈکشنری انگریزی میں حروف تہجی کے مطابق ہو گی۔"

اس نئے منصوبہ کی مزید تفصیل ۱۲/ اگست ۱۹۹۷ء کو ان الفاظ میں لکھی:

"ایک تجویز اور ہے۔ دہلی کے ایک مشہور پبلشر UBS نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ایک Dictionary of Islam تیار کروں، جس میں اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات ہوں، جو نہ صرف مسلمانوں کے لئے مفید ہو نگی بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی۔ یہ ڈکشنری تقریباً آٹھ سو صفحوں پر مشتمل ہو گی۔

اس کتاب میں ابتدائے اسلام کے حالات، رسول کریم (ﷺ) کی زندگی، صحابہ، غزوات، وسریات کا ذکر، رسول کریم کی ازواج مطہرات کے حالات اور اسلام کی تبلیغ، اسلامی فقہ، حدیث اور تفسیر سے بحث، فلسفہ، سائنس اور علوم دیگر میں مسلمانوں کے اضافے وغیرہ وغیرہ شامل ہو نگے۔ یہ ڈکشنری Alphabetical Order میں یعنی ABCD (ابجد) کے حساب سے ہو گی تاکہ ضرورتمند آسانی سے جو موضوع دیکھنا چاہیں دیکھ سکیں..... میں نے کچھ Items تیار کئے ہیں..... ان کی ایک فوٹو کاپی آپ کو بھیجدونگا اور بعد میں بھیجتا رہوں گا..... اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو آپ سے علی گڑھ میں ہو گی..... یہ اسلام کی بڑی خدمت ہو گی!"

جواب میں راقم نے کچھ اشکالات کا اظہار کیا تو شاید ایک اور خط آیا جو اس وقت

میرے سامنے نہیں، بہر حال آخری سفر علی گڑھ ۲۲۔ ۲۴/اکتوبر ۱۹۹۹ء کے دوران میں نے مذکورہ ڈکشنری کا اجمالی خاکہ اور نمونہ کے چند ٹائپ شدہ مقالات دیکھے، ان میں سے کئی صفحات کا پہلا مقالہ اللہ (عزوجل) کے عنوان پر مجھے یاد ہے۔ یہاں اگر کسی کو بے ساختہ علامہ شبلی نعمانی رحمتہ اللہ کی مشہور رباعی یاد آجائے تو حیرت کی بات نہیں کہ اس کا مفہوم سیاق کے کچھ اختلاف کے باوجود مقبول صاحب پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستان لکھی — مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

خلاصہ حیات

متنوع موضوعات پر ڈھیر سی تحریروں کی روشنی میں بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بنیادی طور پر ساری عمر مقبول صاحب کا اوڑھنا بچھونا علمی سرگرمی تھی، پنشن کے بعد تقریباً اکیس برسوں میں متعدد نئے اداروں سے وابستگی کے باوجود بھی ان کے شب و روز کے علمی معمولات میں فرق نہ آتا تھا، مختلف النوع مشاغل میں اپنے اصلی کام کی طرف متوجہ رہنے کا عجیب ملکہ ان کو قدرت نے عطا فرمایا تھا، وہی ان کی روحانی غذا تھی جس کی طاقت سے وہ ہر وقت تازہ دم اور خوش و خرم نظر آتے تھے، ان کا علمی انہماک ان کے ساتھ کام کرنے والے طلبا واساتذہ کے لئے ضرب المثل تھا اور ہر سنجیدہ شخص نے ان سے کام کا عزم و حوصلہ پایا۔

پروفیسر محمود الحق صاحب ادارہ علوم اسلامیہ میں اپنی ابتدائے ملازمت (۵۶۔۱۹۵۷ء) کا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ رات بجلی منقطع ہو جانے پر ہم لوگ گھر واپسی کے ارادہ سے اپنے اپنے کمروں سے باہر نکلتے تو مقبول صاحب کو ان کے کمرے میں موم بتی کی روشنی میں مشغول دیکھ کر سبق لیتے اور رک جاتے کہ کام اس طرح بھی ممکن ہے، پھر تھوڑے دن میں موم بتی کا وہی اہتمام ہم لوگ بھی کرنے لگے۔

علی گڑھ میں دوپہر کو عام معمول قیلولہ کا ہے اور چلچلاتی گرمی کی دوپہر میں لکھنے پڑھنے کا تصور بھی کم ہی لوگ کرتے ہونگے، ۶۷۔۱۹۶۸ء کے بعد جب مقبول صاحب کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی، ایسے ہی موسم کی دوپہر میں ایک مرتبہ اتفاق سے میں نے ان کو مشغول کار پایا تھا، وہ اپنے وسیع گھر "زرافشاں" کے ایک جانبی چھوٹے سے کمرہ میں گرمی کے لحاظ سے بے جوڑ کپڑے پہنے ہوئے ٹائپ رائٹر پر براہ راست مسعودی کی مروج الذھب کا انگلش ترجمہ کر رہے تھے۔

پھر ۱۹۷۷ء میں جبکہ وہ ساٹھ برس کے لگ بھگ ہو رہے تھے ان کے ساتھ سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز میں کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس زمانہ سے وقت بے وقت صبح وشام ورات، تعطیل وغیر تعطیل گھر پر آمد ورفت ہوتی تھی، لیکن کم ہی ایسا موقع آیا ہوگا کہ وہ فالتو بیٹھے ملے ہوں، ہمیشہ لکھنے پڑھنے میں منہمک دیکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر آنے والے کی رعایت سے کام چھوڑ کر بے تکلفی سے دیر تک دلچسپ موضوعات پر گفتگو کرتے گویا کہ اس کی آمد کے منتظر ہوں، اور اس طرح خود آرام کر لیتے اور ملاقاتی کو شاد کام!

قیام لندن کے دوران ۱۴ر مارچ ۱۹۹۶ء کو پھیپھڑے میں کینسر کا پتہ چلا، سات آٹھ ماہ علاج ہوا، طبیعت سنبھلی تو ۹ر ستمبر ۱۹۹۶ء کو علی گڑھ تشریف لائے۔ ملاقات ہوئی تو زندگی میں پہلی بار واقعی بیمار و کمزور، بلکہ زار نزار چور چور معلوم ہوئے، عرض کیا کہ ابھی تو زحمت سفر سے احتیاط کرنا تھی اور لندن ہی میں علاج و معالجہ اور آرام ضروری تھا، فرمانے لگے: ارے بھائی! فلاں انسائیکلوپیڈیا کے لئے زیر ترتیب مقالہ کا تقاضا تھا، اس کے کچھ کاغذات، حوالے اور مواد یہیں رہ گیا تھا، وہ لینے تو آنا ہی تھا، بہت دیر ہو گئی!

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے:

زندگی کے اس زاویہ نگاہ سے یہی سبق ملتا ہے کہ جس کو علم کی اس خاردار وادی میں قدم رکھنا ہو تو پھر عمر بھر کا سودا سمجھ کر قدم رکھے، حالات کی اونچ نیچ، ماحول کی

سازگاری یا ناسازگاری اور صحت و مرض کا کیا غم؟

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

آخر وقت تک دل و دماغ کی تمام صلاحیتیں اس نصب العین کے تابع ہو جاتی ہیں جس کو انسان نے خود اپنے لئے سوچ سمجھ کر پہلے دن متعین کیا ہوتا ہے، اس کی راہ میں ہر مشکل آسان اور ہر رکاوٹ مہمیز کا کام دیتی ہے۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ مقبول صاحب ان خوش نصیب لوگوں میں تھے جن کو بہت آرام کی آسودہ زندگی میسر آئی، ملازمت کی ابتدا سے بچوں کی تعلیمی ضروریات پوری ہونے تک یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ کی طرح ان کی زندگی بھی عسرت کا شکار تھی، مزید کسر بے سوچے سمجھے شاہ خرچی پورا کر دیتی تھی، اس پر بیگم کے مہم جویانہ فیصلے، نیز یونیورسٹی میں نرم گرم آزمائشی حالات سے سابقہ بھی ان کو کچھ زیادہ ہی پڑا، آسودگی آئی تو اہل و عیال کے تتر بتر ہونے کے بعد، اب پوری گھریلو زندگی نوکروں کے رحم و کرم پر تھی، لیکن امر واقعہ کو تسلیم کر کے راضی برضائے الٰہی رہنے کا گر سیکھنا ہو تو بھی مقبول صاحب ہی کی زندگی سے سیکھنا چاہیے، کبھی اہل و عیال کا شکوہ و شکایت نہ سنی، اس کے برعکس ہمیشہ ان کی خوشی سے خوش ہوتے دیکھا اور ان کی کامیابیوں اور صلاحیتوں کا فخر سے تذکرہ کرتے ہوئے ہی سنا، گویا کہ یہ بھی ان کی قربانیوں ہی کا صلہ ہو، اور یقیناً تھا بھی ایسا ہی، اہل و عیال کے ہوتے ہوئے ان کی ترقی اور خوشحالی کی خاطر چوتھائی صدی سے زیادہ کسی شکوہ شکایت کے بغیر مسافرت کی درویشانہ زندگی بھی گذار کر دکھادی!

حسبی و نسبی شرافت ورثہ میں ملی تھی، اعلیٰ تعلیم نے فراخدلی اور تہذیب کا پتلا بنادیا تھا، حسن اخلاق اور خوش معاملگی معمول تھا۔ کبھی ماتحت عملے اور طلبا کو شکایت کا موقعہ نہ دیا، شفقت اور محبت سے دل جیتتے اور رام کرتے۔ ضرور تمندوں کی حاجت روائی خاموشی اور کشادہ دلی سے کرتے۔ گھریلو ملازمین کی آئندہ رہائش تک کا خیال رکھا، ان کی آل اولاد کی شادی بیاہ میں ہمیشہ معاونت کی اور شریک ہوتے رہے، بلکہ ایک لڑکے کو تو

پالا پوسا اور اس کی تعلیم و تربیت کی کفالت بھی کی۔ آخری زمانہ میں ایک نوعمر خادمہ کو قرآن اور اردو پڑھاتے ہوئے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور شادی کرانے کے بعد اس کی خیر خبر لینے دہلی میں اس کی سسرال بھی گئے تھے۔ سنٹر کے تعزیتی جلسہ میں پروفیسر شاد بانو نے بھی اپنی معلومات کی روشنی میں محلّہ کی محتاج بیواؤں کی مدد اور ان کی لڑکیوں کی شادی میں غیر معمولی فیاضانہ تعاون کا ذکر خیر کیا تھا۔ رکشا چلانے والوں سے بحث نہ کرتے، منھ مانگے پیسے دے دیتے اور حجت کرنے والوں کو ناپسند کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور ہم سب کی لغزشوں سے درگذر فرمائے، مغفرت کا معاملہ فرمائے اور بہترین اجر سے نوازے! بڑی خوبیوں کے حامل تھے!!!

حواشی :

۱۔ پروفیسر اور صدر شعبہ اسلامیات، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد، رٹائر ہوئے عرصہ ہو گیا۔

۲۔ قیصر صاحب لائبریری شعبہ اسلامیات علی گڑھ سے ریٹائرمنٹ کے بعد عرصہ تک مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے مخطوطات سیکشن سے وابستہ رہے۔

3- 1.1. Krachkovsky, Izbrannye Sochiceniya, Vol.4, Arabskaya Geograficheskaya literatura, Moscow, 1957.

۴۔ تاریخ الادب الجغرافی العربی، دو جلد ۶۳-۱۹۶۵ء، تیسرا ایڈیشن دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۷ء

۵۔ مکان آنجہانی بنرجی، کیلا نگر متصل بنگلہ پروفیسر شاد بانو، سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ۔

6- The Indian Press, Allahabad, 1946; PP.327

۷۔ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد ۱۹۳۰ء، طبع جدید دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۷۹ء صفحات ۴۰۰

۸۔ سید مقبول احمد، مٹی سے ہیرا، ناولستان، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، صفحہ ۷

۹۔ ایضاً صفحات ۱۵-۱۶

Professor Syed Maqbool Ahmad
Hayat-o-Khidmat

By

Masoodur Rahman Khan Nadvi
Centre of West Asian Studies
Aligarh Muslim University, Aligarh

1336

auda Bakhsh Oriental Public Library
Patna